Cat

B

سلسلۂ دار المصنفین

(نمبر ۷۲)

بزمِ تیموریہ

یعنی ہندوستان کے تیموری بادشاہوں، شہزادوں اور
شہزادیوں کی علم دوستی، علما نوازی اور اُن کے درباری شعرا
و فضلاء، اور دوسرے اصحابِ کمال کا تذکرہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم-اے

(رفیق دار المصنفین)

باہتمام

مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپی،

سنہ ۱۳۶۷ھ
۱۹۴۸ء

بحکمِ خدا و خرد

Ex Libris

Asaf Ali-Asghar Fyzee

Presented to the Library of
The University of Jammu & Kashmir
June 1, 1957

فہرست مضامین

بزم تیموریہ

شاہ عالم بہادر شاہ
۲۹۴ - ۳۰۰

فرخ سیر
۳۰۰ - ۳۰۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تیموری سلاطین رزم و بزم دونون میدانون کے مرد تھے، وہ جس درجہ کے فاتح و کشور کشا تھے اسی درجہ کے علم پرور اور ادب نواز بھی، وہ ترکی اور فارسی دونون مین اور آخری دور کے بادشاہ اردو مین بھی کمال اور شعر و ادب کا نہایت بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، اور اس کے نکتہ سنج نقاد تھے، جیسا کہ ان کی نظم و نثر اور تذکرون کے بیانات سے ظاہر ہے،

ان کے دور مین ہنگامۂ کارزار کے ساتھ علم و ادب کی محفل بھی گرم تھی، انکا دربار ہر فن کے اصحاب کمال اور علماء و شعراء کا مخزن تھا، اور انکی سرپرستی مین بہت سے علمی و ادبی کام انجام پائے، لیکن اس زمانہ مین تاریخ نویسی کا مذاق ایسا تھا کہ مورخین سارا زور قلم فتوحات اور کشور کشائی کی داستان سرائی مین صرف کر دیتے تھے، اور علم و ادب کے حالات کی جانب انکی توجہ کم رہتی تھی، تاہم اس دور کی تاریخین انکے ذکر سے یکسر خالی بھی نہین ہین لیکن رزم کے مقابلہ مین انکے نقوش اسقدر دھندلے اور پراگندہ ہین کہ ان سے انکا پورا مرقع نظر نہین آتا،

تیموری سلاطین کی رزمیہ داستانین تو بہتون نے سنائی ہین لیکن انکی انجمن آرائی کے دلچسپ افسانے بہت کم لوگون نے سنائے ہین، اور گو ضمناً انکی ادب نوازی کے واقعات اور اس عہد کے شعراء و ادباء کے متفرق حالات لوگون نے لکھے ہین لیکن ابتک پورے استیعاب کے ساتھ اس دور کا ادبی گلدستہ کسی نے تیار نہین کیا ہے، اسلیے دار المصنفین مین جب تاریخ ہند کی تدوین کا کام شروع ہوا تو خیال ہوا کہ تیموریون کے سیاسی و تمدنی کارنامون کے ساتھ انکی علم پروری اور ادب نوازی کا نقشہ بھی دکھایا جائے، تاکہ ان کے کارنامون کا ہر رخ سامنے آجائے،

چنانچہ ہمارے رفیق سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے نے جنکے متعلق تاریخ ہندوستان کے بعض حصے کیے گئے تھے، اس کام کو شروع کیا، اور معارف مین تیموری بادشاہون کے علمی ذوق کے عنوان سے مضمون کا ایک سلسلہ شروع کیا جو اتنا بڑھا کہ ایک کتاب کے بقدر ہو گیا، اسلیے اسکو مستقل کتابی صورت مین شائع کر دینا مناسب معلوم ہوا، اسکی نظر ثانی مین انھون نے بہت سے اور معلومات کا اضافہ بھی کیا ہے اور اب اسکی ضخامت پہلے سے دونی ہو گئی ہے،

تیموریون کے عہد کے علما، وفضلا، اور شعرا وادبا، اور انکے علمی وادبی کارنامون کی فہرست بہت طویل ہے، اسلیے اس کتاب مین صرف ان ہی لوگون کو لیا گیا ہے جو انکے دربار سے متوسل تھے، اور انہی کارنامون کو لکھا گیا ہے جو شاہان تیموری کی سرپرستی مین انجام پائے، اُن مین بھی بہت سے شعرا کو طوالت کے خیال سے قلم انداز کر دیا گیا ہے، بعض ممتاز شعرا مثلاً فیضی، طالب آملی، نظیری، کلیم اور صائب وغیرہ پر اسلیے مختصر لکھا گیا ہے کہ انکی شاعری پر مفصل تبصرہ شعر العجم مین موجود ہے جس پر اضافہ کرنا ممکن نہ تھا، اور ان ہی کو دہرانا تحصیل حاصل تھا، بعض شعرا کے کلام کے انتخاب مین قصداً اختصار سے کام لیا گیا ہے، البتہ کہین کہین طویل قصائد اسلیے نقل کر دیے گئے ہین کہ اس دور کی قصیدہ نگاری کا اندازہ ہو سکے،

اردو زبان کی ترقی مین تیموریون کا بڑا حصہ ہے لیکن یہ ایک وسیع موضوع تھا، اسلیے اس کتاب مین اس سے بحث نہین کی گئی لیکن محمد شاہ، شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر کی شاعری پر تبصرہ سے اسکا کسی قدر اندازہ ہو جائے گا،

بہرحال تیموری سلاطین کی علم پروری اور ادب نوازی کا یہ مرقع اصحابِ نظر کی خدمت مین پیش ہے، اور ان کے نقص وکمال کا فیصلہ وہی کر سکتے ہین،

افسوس ہے کہ صحت کے اہتمام کے باوجود کتاب مین کتابت وطباعت کی غلطیان رہ گئی ہین جن کی صحت کے لیے آخر مین غلطنامہ لگا دیا گیا ہے، ناظرین اس سے تصحیح فرمالین،

ہیچمدان
سید سلیمان ندوی
۲۸ اگست ۱۹۴۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابر

بابر نہ صرف ایک عدیم المثال سپاہی، عظیم المرتبت فاتح اور اولوالعزم بادشاہ تھا، بلکہ ارباب بصیرت نے اس کو ایک بلند پایہ اہل قلم اور قابل قدر شاعر بھی تسلیم کیا ہے، وہ تیمور کی چھٹی نسل میں تھا، ترکہ میں میدانِ کارزار کی پامردی و شجاعت کے علاوہ علم و ثقافت سے بھی شیفتگی و دلدادگی بھی پائی تھی، عام طور سے تیمور کو ایک ظالم اور سفاک فاتح کہا جاتا ہے، مگر اس کی یہ تصویر ان مورخوں نے کھینچی ہے جنھوں نے تعصب کی عینک لگا کر اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، ورنہ ملک گیری اور کشور کشائی کی معرکہ آرائی کے ساتھ ساتھ اس نے علم و فن کی انجمن آرائی بھی اسی طرح کی جس طرح ایک تاج و تخت کے مالک کو کرنا چاہیے، چنانچہ ارباب فضل و کمال خلوت و جلوت بلکہ میدانِ جنگ میں بھی اس کے ساتھ رہتے تھے، تزوک تیموری میں خود اس کی زبان سے ہے کہ

"محدثین، ارباب اخبار و قصص کو میں اپنے پاس بلاتا، ان سے انبیاء، اولیاء اور سلاطین کے قصے سنتا، سلاطین کے عروج و زوال کے واقعات معلوم کرتا، ان حکایات کے قصے اور ان کی گفتار و کردار سے تجربے حاصل کرتا اور دنیا کی فنا پذیری کے آثار سے

مطلع ہوتا، مشائخ، صوفیہ اور عارفانِ خدا سے بھی ملتا، اور ان کی صحبت سے اخروی فوائد حاصل کرتا، معرفت کی باتیں سنتا، ان کے خوارق عادت وکرامات کا مشاہدہ کرتا، اور ان کی صحبت سے سرور حاصل کرتا تھا۔۔۔۔۔

میرا حکم تھا کہ جو لوگ سادات وعلماء میں سے ہیں ان کا اعزاز واحترام کیا جائے، ان کی ہر ضرورت کو پورا کیا جائے، ان کے ساتھ پوری رعایت ہو[1]

ملفوظات تیموری میں ہے:۔

"جب میں تولبہ پہونچا تو دریا کے ساحل پر خیمہ زن ہوا، تولبہ ملتان سے قریب ستر میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔۔۔۔۔۔ میرے وزراء نے تولبہ کے باشندوں پر دو لاکھ روپے کا تاوان عائد کیا تھا، اس کی وصولی کے لیے عمال بھی مقرر ہو گئے تھے، ان باشندوں میں سادات بھی تھے، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے تھے علماء اسلام بھی تھے، جو وارث پیمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کہلاتے ہیں، سادات وعلماء میرے دربار میں ہمیشہ تعظیم و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، اس لیے میں نے حکم دیا کہ ان سے تاوان نہ لیا جائے، بلکہ میں نے بلا کر خلعت اور عربی گھوڑے عطا کیے،[2]

ملفوظات تیموری میں تیمور کی کشور کشائی اور جہانبانی کی کہانی خود اس کی زبانی ہے، جو اس کے دربار کے ارباب علم ودانش نے قلمبند کی ہے، **تزوک تیموری** میں ملکی وحربی نظم ونسق کے ضوابط وقوانین ہیں، جو خود تیمور کی زبان سے ادا کیے گئے ہیں، ممکن ہے کہ مندرجۂ بالا اقتباسات دربار کے اہل قلم کی حاشیہ آرائی سمجھی جائے، لیکن شرف الدین یزدی نے ظفرنامہ تیمور کی وفات کے تیئس سال بعد لکھی، اس میں مرقوم ہے:

---

[1] تزوک تیموری، مطبع محمد فتح الکریم بمبئی، ص ۱۱، ۱۲، ۱۱۰، ۱۱۲ [2] ملفوظات تیموری الیٹ ج ۳ ص ۴۱۴

"صاحبقران کے ساتھ سفر اور حضر میں برابر سادات، علما، فقہا، اہل فضل و دانش، بخشیان تیمور اور دبیران فارس رہتے تھے، فرمان شاہی کے مطابق وہ روزمرہ کے واقعات قلمبند کرتے، صاحبقران کے افعال و اقوال، ملک و ملت کے احوال اور ارکان دولت کے کوائف بڑی تحقیق کے ساتھ حیطہ تحریر میں لائے جاتے، سخت حکم تھا کہ ہر واقعہ بغیر کسی تصرف اور اضافہ کے لکھا جائے، خصوصاً ذاتی اصالت و نجابت کے بیان میں کسی قسم کی رعایت یا مداہنت نہ ہو حتیٰ کہ صاحبقران کی شہامت و شجاعت کے ذکر میں بھی مبالغہ نہ ہو چنانچہ اس حکم کو سامنے رکھکر اصحاب قلم و بلاغت واقعات کو نظم و نثر میں مرتب کرتے، یہ تحریریں صاحبقران کے سامنے پڑھی جاتیں اور وثوق کے ساتھ ان کی تصحیح ہوتی، اسی طرح ترکی اور فارسی میں واقعات نثر اور نظم میں تالیف ہوتے، دربار کے بعض وابستگان واقعات کی تفتیش و تحقیق میں پوری کوشش کرتے[1]........

تیمور ہندوستان میں محمود تغلق کے خلاف صف آرا ہوا تو شرف الدین یزدی کا بیان ہے کہ میدان جنگ میں ارباب کمال اور اصحاب علم اس کے جلو میں تھے،

دروقت تعیین مواضع سروران و اعیان مرحمت حضرت صاحبقران کہ در ہمہ حال شامل احوال اہل علم و کمال بودی از جمع علما، رفیع مقدار کہ ظفر کردار ملازم رکاب ہمایوں آثار بودند مثل خواجہ افضل پسر مولانا شیخ الاسلام سید جلال الحق والدین کشی و مولانا عبدالجبار پسر اقضی القضاۃ مولانا نعمان الدین خوارزمی......[2]

ہر لڑائی کے بعد فتح و نصرت کی خوشی میں تیمور علما، و سادات کو انعام و اکرام سے مالامال کرتا تھا[3]، دربار کے ایک جید عالم مولانا نظام الدین شامی نے تیمور کی فرمایش پر سادہ

---

[1] ظفرنامہ ج ۱ ص ۲۵ و ۲۴ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۰۱ [3] ملفوظات تیموری، الیٹ ج ۳ ص ۷۵، ۴،

اور سلیس فارسی میں اس عہد کی ایک تاریخ لکھی، اس کا نام بھی **ظفر نامہ** ہے، تیمور کی وفات سے ایک سال پہلے یہ تالیف ختم ہوئی[1]، افسوس ہے کہ یہ ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی ہے،

تیمور کی یہ علم نوازی اور علم پروری اس کی نسل میں برابر منتقل ہوتی رہی، تیمور کے پوتے الغ بیگ کی ہیئت دانی مشہور ہے، الغ بیگ کے دربار کے ممتاز شاعر اور نثر نگار تھے، بابر کے باپ عمر شیخ مرزا کو بھی یہ ثقافتی دولت میراث میں ملی، بابر نے اپنی تزک میں باپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

"ان کے اخلاق و اطوار یہ تھے، حنفی مذہب اور خوش اعتقاد آدمی تھے، پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے، قضائے عمری سب ادا کر دی تھی، بیشتر قرآن شریف پڑھا کرتے تھے، حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے مرید تھے، اکثر ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، حضرت خواجہ بھی ان کو فرزند کہا کرتے تھے، وہ خاصے پڑھے لکھے تھے، خمسین (یعنی خمسہ نظامی و خمسہ خسرو)، مثنوی (یعنی مثنوی جلال الدین رومی) اور تاریخ کی کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں، شاہنامہ بہت دیکھا کرتے تھے، اگرچہ موزوں طبیعت رکھتے تھے، مگر شعر گوئی پر توجہ نہ کرتے تھے"[2]

عمر شیخ مرزا نے تاشکند کے مشہور چغتائی خان یونس خان کی لڑکی قتلق نگار خانم سے بھی شادی کی، اس کی ایک بڑی وجہ یونس خان کی علم دوستی بھی تھی، بابر قتلق نگار خانم ہی کے بطن سے تھا، یونس خان کی ایک اور لڑکی خوب نگار خانم محمد حسین گورگان دغلت کے حبالۂ عقد میں آئی، اس سے ایک لڑکا حیدر میرزا دغلت تھا، جو تاریخ رشیدی کا مصنف ہے حیدر مرزا دغلت

---

[1] برٹش میوزیم کیٹیلاگ (فارسی) ج ۱ ص ۱۷۰، [2] اردو تزک بابری مترجمہ میرزا نصیر الدین حیدر گورگانی ص ۷،

اپنے نانا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"خان (یعنی یونس خان) مولانا شرف الدین علی یزدی کے ساتھ بارہ سال رہے، اور فضائل کا کسب کیا، ان کے ایسا خان ان سے پہلے اور بعد میں نہیں پیدا ہوا، جب مولانا کا انتقال ہو گیا تو خان یزد سے عراق، فارس اور آذربائیجان کی طرف چلے گئے، شیراز میں فضلاء کی مجلسوں میں شریک رہے، یہاں وہ استاذ یونس کے نام سے مشہور ہوئے...... ان میں بہت سے فضائل تھے، قرآن کی قرأت خوب کرتے تھے، موزوں طبیعت بھی رکھتے تھے، موسیقی اور مصوری میں بھی ماہر تھے......."[1]

اوپر کی سطروں سے ظاہر ہوگا کہ بابر کے باپ اور ماں دونوں کا خاندان علمی حیثیت سے بھی متمول تھا، اس لیے اس کی ابتدائی تعلیم بلند پیمانہ پر ہوئی، عہد طفولیت سے عنفوان شباب کے زمانہ تک اس کے جو اتالیق اور اساتذہ مقرر ہوئے، ان کے نام شیخ مزید بیگ، بابا قلی علی، خدائی بیردی بیگ، اور خواجہ مولانا قاضی عبداللہ تھے، شیخ مزید بیگ کا ذکر بابر اپنی تزک میں اس طرح کرتا ہے:۔

شیخ مزید بیگ میرے پہلے اتالیق تھے، ان کے قاعدے اور قرینے بہت اچھے تھے، وہ بابر مرزا (ابن بایسنغر میرزا ابن شاہرخ میرزا ابن امیر تیمور) کی خدمت میں بھی رہے تھے، عمر شیخ کی سرکار میں ان سے بڑا کوئی دوسرا امیر نہ تھا"[2]

بابر اپنے استاد اور پیر خواجہ مولانا قاضی عبداللہ کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"خواجہ مولانا قاضی کا نام عبداللہ تھا، اور عرف خواجہ مولانا تھا، باپ کی طرف سے ان کا نسب شیخ برہان الدین قلیچ تک پہنچتا ہے اور ماں کی جانب سے سلطان ایلیک ماضی تک

---

[1] تاریخ رشیدی مترجمہ ان، الیس، و اس، ڈی، را س ص ۱۵ و ۴۷، [2] تزک بابری ص ۱۴ و ۱۴۳،

ملک فرغانہ میں اس خاندان کے لوگ پیشوا و شیخ الاسلام اور قاضی رہے ہیں، خواجہ مولانا حضرت خواجہ عبید اللہ کے مرید تھے، ان ہی سے تربیت پائی تھی، مجھ کو خواجہ قاضی کے ولی ہونے میں کچھ شک نہیں ہے، .... مولانائے مرحوم عجیب شخص تھے، ڈر اور خوف تو ان میں نام کو نہ تھا، ایسا دلیر آدمی دیکھا نہ سنا، یہ صفت بھی ولایت کی دلیل ہے، دنیا دار کیسے ہی بہادر ہوں مگر کچھ دھڑکا اور اندیشہ رہتا ہے، خواجہ اس سے بالکل پاک تھے"[1]

یہ بتانا مشکل ہے کہ ان لائق اتالیق اور استاذوں کی نگرانی میں بابر کے ابتدائی درس میں کون کونسی کتابیں تھیں، مگر تزک میں اس نے کلام پاک، سعدی کی گلستاں و بوستاں، فردوسی کی شاہنامہ، نظامی اور خسرو کے خمسے، شرف الدین علی یزدی کی ظفرنامہ، اور ابو عمر منہاج الجوزجانی کی طبقات ناصری کا جا بجا ذکر ہے، اس لیے قیاس بلکہ صحیح قیاس ہے کہ خاندانی روایات کے مطابق یہ کتابیں اس کی ابتدائی تعلیم کے درس میں ضرور رہیں، بابر کی مادری زبان ترکی تھی، مگر اس زبان کے علاوہ اس نے عربی اور فارسی کی بھی پوری تعلیم پائی، جیسا کہ مندرجہ بالا کتابوں کے نام سے ظاہر ہے،

بابر سن شعور کو پہنچا تو آبائی مملکت کو علوم و فنون کا گہوارہ پایا، سمرقند، فرغانہ، خراسان، اور خصوصاً شہر ہرات ارباب فضل و کمال سے پر تھا، بابر نے ان مقامات کے علماء و شعراء سے بالواسطہ اور بلا واسطہ کسی نہ کسی طرح سے استفادہ ضرور کیا ہے، بچپن کے زمانہ میں اس نے مولانا عبد الرحمن جامی علیہ الرحمہ کی شہرت سنی تھی، اور جب وہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو مولانا جامی کا وصال ہو چکا تھا، مگر ان کی ذات سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، اپنی تزک میں ان کا ذکر کرنا باعث برکت سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں علوم ظاہر و باطن میں اپنا نظیر نہ رکھتے

---

[1] تزک بابری ص ۵۰ و ۵۱، باباتلی ملی [illegible] زمانی بیرمی بیگم کے ذکر کے لیے دیکھو تزک بابری ص ۲۰۱ و ۳۰۳،

تھے، اور جوش عقیدت میں ان کے مزار کی زیارت کو بھی گیا،

بابر شیخ الاسلام سیف الدین احمد سے بھی متاثر تھا، وہ ملا سعد الدین تفتازانی کی اولاد میں سے تھے، ترکستان سے آکر خراسان کے شیخ الاسلام ہوئے، ان کے بارے میں بابر لکھتا ہے کہ نہایت سمجھدار تھے، علم معقول و منقول سے خوب واقفیت رکھتے تھے، بڑے پرہیزگار اور متدین عالم تھے، شافعی تھے، مگر ہر مذہب کی رعایت کرتے تھے، ستر برس تک انھوں نے جماعت کی نماز ایک روز بھی ناغہ نہیں کی، بابر ملا شیخ حسن کے علم کلام کا بھی قائل تھا، اس کی رائے میں وہ حکمت، معقول اور علم کلام کے بڑے ماہر تھے، تھوڑے لفظوں میں بڑے بڑے مضامین کا بیان کرنا ان کے اختراعات میں سے تھا، ان کا ثانی کوئی نہ تھا، اجتہاد کے مرتبہ پر پہنچ گئے تھے، مگر اجتہاد نہ کرتے تھے، علم حدیث میں بابر میر جمال الدین محدث کا قدردان تھا، ان کے بارے میں وہ رقمطراز ہے کہ "خراسان میں علم حدیث کا جاننے والا ان جیسا کوئی نہ تھا" عربی ادب میں بابر میر عطاء اللہ مشہدی کا معترف تھا، جس نے علم قافیہ میں ایک فارسی رسالہ لکھا تھا، اس کا ایک رسالہ صنایع بدایع بھی تھا جس میں شعر کے صنائع پر بحث ہے، بابر کو یہ رسالہ بہت پسند تھا، علم فقہ میں بابر قاضی اختیار کا قائل تھا، جنھوں نے فقہ میں ایک "عمدہ" رسالہ بھی تصنیف کیا تھا،

بابر نے اپنے ہم عصر شعراء سے بھی براہ راست یا غائبانہ مراسم رکھے، اور ان کے کلام کا مطالعہ عمیق نظروں سے کیا، ان شعراء پر اس نے جو نقد و تبصرہ کیا ہے اس سے اس کی سخن سنجی اور سخن فہمی کے بلند ذوق کا اندازہ ہوگا، مثلاً علی شیر بیگ نوائی کے بارے میں لکھتا ہے:-

علی شیر بیگ بے نظیر آدمی تھا، ترکی زبان میں شعر کہا کرتا تھا اور ایسا کہتا تھا کہ دوسرا کیا کہے گا، اس نے چھ مثنویاں لکھی پنج تو خمسہ کے جواب میں ہیں اور ایک منطق الطیر کے وزن پر لسان الطیر لکھی ہے، غزلوں کے چار دیوان مدون کیے ہیں، جو اسکے نام پر ہیں،

غرائب الصغر، نوادر الشباب، بدیع الوسط، فوائد الکبر، ان کے علاوہ اور تصانیف بھی ہیں جو ان سے کمتر درجہ کی ہیں، مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے طرز پر ایک انشا بھی لکھی ہے، جو خطوط جن کے نام لکھے تھے، وہ جمع کر لیے ہیں، ایک کتاب میزان الاوزان نام فن عروض میں لکھی ہے، اس میں گھڑت بہت کی ہے، رباعی کے چوبیس وزن میں سے چار وزن غلط لکھے ہیں، بعض بحروں کے اوزان میں بھی غلطی کی ہے، جو شخص اس کو دیکھے گا جان جائے گا، ایک دیوان فارسی میں بھی لکھا ہے، فارسی میں فانی تخلص ہے، اس کے بعض اشعار برے نہیں ہیں، مگر اکثر گرے ہوئے ہیں، فن موسیقی میں بھی اچھی چیزیں لکھی ہیں، عمدہ نقش اور پیشرد بنائے ہیں، اہل فضل اور اہل ہنر کا قدر دان و مربی علی شیر بیگ جیسا دوسرا آدمی پیدا ہونا دشوار ہے"۔

ایک اور شاعر شیخم بیگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

اس نے اپنا تخلص سہیلی رکھا تھا، اس لیے شیخ سہیل مشہور ہو گیا، اس قسم کا شعر کہتا تھا جس میں ڈراونے الفاظ اور معانی ہوں، اس کے اشعار میں سے ایک شعر ہے:

شب غم گرد باد آہم ز جا مے برد گردوں را

فرو برد اژدہائے سیل اشکم ربع مسکوں را

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس شعر کو مولانا عبدالرحمٰن جامی کے سامنے پڑھا، مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ صاحب آپ شعر کہتے ہیں یا آدمی کو ڈراتے ہیں، اس نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا، اور مثنویاں بھی لکھی ہیں،

اختصار و ایجاز اور جامعیت کے ساتھ بابر نے اور شعراء پر تنقیدیں کی ہیں ان کے نمونے بھی ملاحظہ ہوں،

شاعروں میں ایک آصفی تھا، وزیر زادہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنا تخلص آصفی رکھا،

اس کے اشعار با معنی اور رنگین ہیں، عشق و حال دونوں میں کورا تھا، اس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اپنا کلام کبھی جمع نہیں کرتا، شاید یہ دعویٰ بناوٹی ہو، کہتے ہیں کہ اس کا کلام انیسی اسفرائی نے جمع کیا ہے، غزل کے علاوہ اور صنف میں شعر کم کہتا تھا، میں جس زمانہ میں خراسان گیا ہوں اس زمانہ میں مجھ سے ملا تھا، ایک بنائی تھا، ہری کا رہنے والا، اس کے باپ کا نام استاد محمد بنا (معمار) تھا، اسی مناسبت سے اس نے اپنا یہ تخلص رکھا تھا، اس کی غزلوں میں رنگ اور حال دونوں باتیں ہیں، اس نے دیوان مرتب کرلیا ہے، مثنویاں بھی کہی ہیں، ایک مثنوی میوہ کے تلازمہ میں لکھی ہے، جس کی بحر تقارب ہے، لغو مثنوی ہے، ایک مختصر مثنوی بحر خفیف میں ہے، ایک اس سے بڑی مثنوی ہے بحر خفیف ہی میں، اس مثنوی کو آخر عمر میں پورا کیا ہے، .... ایک شاعر عیفی بخاری تھا .... ایک دیوان تو اس نے معمولی طرز سے لکھا ہے اور دوسرا تمام اہل حرفت کے واسطے ہے، اس میں مثالیں بہت باندھی ہیں، اس کی کوئی مثنوی نہیں ہے، اپنے اس قطعہ میں وہ کہتا ہے:

مثنوی گرچہ سنت شعر است — من غزل فرض عین می دانم

پنج بیتے کہ دل پذیر بود — بہتر از خمستین می دانم

ایک رسالہ عروض کا فارسی میں بھی لکھا ہے، اشعار اس کے کم ہیں، مگر ایک طرح وہ پرگو ہے، کم تو اس سبب سے کہ کوئی کام کی بات نہیں لکھی، اور پرگو اس لحاظ سے کہ چکنے ہوئے فقرے، کھلے الفاظ اور اعراب کے ساتھ لکھے ہیں، .... ایک شاعر عبداللہ مثنوی گو جام کا رہنے والا ملا کا بھانجا تھا، ہاتفی اس کا تخلص تھا، خمسہ کے مقابلہ میں اس نے مثنویاں لکھی ہیں، ہفت پیکر کے جواب میں تیمور نامہ لکھا ہے، اس کی مثنویوں میں سے لیلی مجنوں بہت مشہور مثنوی ہے، گو جیسی شہرت ہے ویسی عمدہ نہیں ہے، ایک میر حسین معمائی

تھا، غالباً اس جیسا معما کسی نے نہ کہا ہو، اس کی عمر معما ہی کہنے میں گزری، عجیب فقیر مزاج، نامراد اور بے بدل آدمی تھا، ایک ملا محمد بدخشی تھا، اشکمش کا رہنے والا، جو داخل بدخشاں نہیں ہے، مگر تعجب ہے کہ تخلص بدخشی تھا، اس کے اشعار مذکورۂ بالا شعراء کے اشعار کے برابر نہ تھے، فن معما میں اس نے رسالہ لکھا ہے، اس کا معما عمدہ نہیں ہے، البتہ خوش صحبت آدمی تھا، سمرقند میں مجھ سے ملا تھا، ایک یوسف بدیعی فرغانہ کا رہنے والا تھا، قصیدہ خاصہ کہتا تھا، ایک آہی تھا، غزل اچھی کہتا تھا، صاحب دیوان تھا، ایک محمد صالح تھا، اس کی غزلوں میں چاشنی ہوتی تھی، مگر بندش اس چاشنی کے برابر نہ ہوتی تھی، ترکی میں بھی شعر کہتا تھا، اور برا نہ کہتا تھا، آخر میں شیبانی خان کے پاس آگیا تھا، وہاں تھوڑی بہت قدر ہوگئی تھی، ترکی زبان میں شیبانی خان کے نام پر ایک مثنوی لکھی ہے، لیلیٰ مجنون وزن رمل مسدس میں جو وزن سبحہ ہے، یہ مثنوی سست اور گری ہوئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک شاعر شاہ حسین کامی تھا، اس کے اشعار برے نہیں ہیں، غزل گو تھا، غالباً اس کا دیوان بھی ہو، ایک مثنوی بھی اس نے لکھی ہے، ایک ہلالی تھا، دیوان کے علاوہ اس کی ایک مثنوی بھی ہے، اگرچہ اس کے اور اشعار ایک انداز کے ہیں، مگر اس مثنوی کا مضمون اور بندش دونوں خراب ہیں، پچھلے شاعروں نے جو عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں ان میں عاشق کو مرد اور معشوق کو عورت باندھا ہے، اس نے ایک فقیر کو عاشق بنایا ہے، اور بادشاہ کو معشوق، جو اشعار بادشاہ کے اقوال اور افعال کے لکھے ہیں، ان میں سراسر فحش ہے، اپنی مثنوی لکھنے کے لیے ایک بادشاہ کی نسبت ایسا لکھا ہے کہ فواحش کی نسبت بھی نہیں لکھا جاتا، اس کا حافظہ بہت قوی تھا، چالیس ہزار شعر یاد تھے۔ کہتے ہیں کہ اکثر خمستین کے اشعار یاد کر لیے تھے، علم عروض و قافیہ میں اس کی بڑی شہرت تھی، اس کے اشعار برے نہیں ہیں، صاحب

دیوان بھی ہے"[5]

تزک بابری | بابر نے اسی طرح اور دوسرے شعرا پر بھی اپنی وقیع رائے کا اظہار کیا ہے، جس کو ہم یہاں پر طوالت کی خاطر نقل کرنے سے گریز کرتے ہیں، اس کے علمی ذوق میں مذکورۂ بالا فضلا کی صحبت اور شعرا کے مطالعۂ کلام سے جو جلا ہوئی اسی کا نتیجہ اس کی **تزک بابری**[2] ہے جس کا شمار آج بھی دنیا کے بہترین علمی اور تاریخی سرمایہ میں کیا جاتا ہے، اور ہر ملک کے ارباب کمال نے بڑے ذوق وشوق سے اپنی اپنی زبانوں میں اسکے ترجمے کیے ہیں، یہ کتاب بابر نے اپنی مادری زبان ترکی میں لکھی تھی، گو ترکی کسی زمانہ میں اعلیٰ قسم کی علمی زبان نہیں رہی، لیکن بابر نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے اس زبان میں بھی ایسا سلیس، لطیف اور شگفتہ طرز بیان اختیار کیا کہ اس کی کتاب ارباب علم وفن کے لیے جاذب توجہ ہو گئی اور اس کے ترجمے میں پڑھنے والے کو وہی لذت محسوس ہوتی ہے، جو ترکی جاننے والوں کو اصل کتاب میں ملتی ہوگی، ابوالفضل مؤلف اکبرنامہ بلاشبہہ دنیا کے اعلیٰ انشاپردازوں میں ہے، وہ تزک بابری کی فصاحت اور بلاغت کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے،

"وواقعات خود را از ابتداے سلطنت خود تا حال ارتحال از قرار واقع بعبارت فصیح وبلیغ نوشتہ اند،

پھر اس کتاب کی گوناگوں خوبیوں میں رطب اللسان ہوتا ہے،

دستور العلیست بجہت فرمانروایان عالم، وقانونیست در آموختن اندیشہای درست وتفکرہاے صحیح براے تجربت پذیراں ودانش آموزان روزگار، وآں دستور العمل دولت واقبال را بموجب حکم جہاں مطاع شہنشاہی بتاریخ سی وچہار الٰہی وقتیکہ رایات عالیات

---

[1] تزک بابری ص ۸۶، ۱۰۴، ۱۶۸، ۱۷۵، [2] تزک بابری کے نام واقعات بابری اور بابرنامہ بھی ہیں،

"از گلگشت بہارستان کشمیر و کابل مراجعت فرمودہ بود میرزا خان خانخانان بن بیرم خاں بفارسی ترجمہ نمود تا فیض خاص الخاص آن بعموم تشنہ لبانِ رشحات سعادت فائز شود، و گنج پنہان او در نظر تہی دستانِ دانش آشکارا گردد"[1]

ممکن ہے کہ تزک بابری کی یہ مدح سرائی بابر کے پوتے کے ایک درباری مورخ کی محض خوشامد پر محمول کی جائے، مگر موجودہ دور کے یورپین مبصرین اور ناقدین نے اور بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کتاب کی تعریف و توصیف کی ہے، حالانکہ وہ مسلمانوں کے کسی علمی اور تاریخی کارنامے کے لیے اچھے الفاظ استعمال کرنا پسند نہیں کرتے ہیں، ہنری ایلیٹ لکھتا ہے:-

بابر کی تزک ان سوانحعمریوں میں ہے جو سب سے اچھی اور سب سے سچی کہی جا سکتی ہیں......

..... یہ کسی طرح سے (Expedition of Xenophon) سے کمتر درجہ کی نہیں (Commentaries of Caesar) سے کچھ ہی کم ہو سکتی ہے"

یہی انگریز اہل قلم آگے چل کر تحریر کرتا ہے:

یہ کتاب نہ صرف تاریخی واقعات کے لیے اہم ہے، بلکہ اس میں بہت سی معلومات ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہنشاہ (یعنی بابر) کس قدر غیر معمولی دماغ کا آدمی تھا، اور اسکا مشاہدہ کتنا قوی تھا، موجودہ دور کے سیاحوں نے اعتراف کیا ہے کہ بابر نے کابل، فرغانہ، اور ہندوکش کے شمالی علاقوں سے متعلق جو بیانات قلمبند کئے ہیں وہ اپنی صداقت اور تفصیلات کے لحاظ سے آج بھی دلچسپی سے پڑھنے کے لائق ہیں، اور ان میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا، ہندوستان کی جو تصویر اس نے کھینچی ہے وہ بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے" اس ملک میں ۱۵۲۵ء میں وہ فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا، اس نے یہاں جو کچھ

---

[1] اکبرنامہ ج ۱ ص ۱۱۸

دیکھا اور پایا اس کو پچیس صفحوں میں تحریر کیا ہے۔ اس ملک کے نہ صرف حدود اربعہ، آبادی، آمدنی، ذرائع آمدنی وغیرہ کا صحیح صحیح حال لکھا ہے، بلکہ یہاں کے پھلوں، پھولوں، درختوں، پرندوں، چوپایوں، اور آبی جانوروں کے عادات و خصوصیات سے متعلق اتنے مفید معلومات فراہم کئے ہیں کہ موجودہ دور کے ماہرین نباتات و حیوانات بھی ان سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ان چیزوں کے متعلق اپنے مشاہدات کا ذکر کرتا ہے، اور پھر دوسروں سے جو کچھ سنا تھا اس کا بھی تجزیہ کرتا ہے، آخر میں ان چیزوں کی ترقی کے لیے اپنے ذاتی مشورے بھی پیش کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔[1]

سوانح بابر مولفہ ولیم ارسکن میں اس کتاب کی خوبیاں ان الفاظ میں بتائی گئی ہیں،

بابر کی تزک اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب ہے، جن حالات میں اس نے یہ لکھی وہ اور تعجب خیز ہے، اس میں ایک تاتاری فرمانروا کی زندگی کی جزوی تفصیلات ہیں، اس کی رائے اور اس کے جذبات بالکل فطری طور پر نظر آتے ہیں، ان میں کوئی تصنع اور تکلف نہیں، ہر چیز صفائی اور سچائی سے لکھی گئی ہے، طرز تحریر سادہ اور مردانہ ہے، اسی کے ساتھ شگفتہ اور دلآویز بھی ہے، یہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو غیر معمولی ذہانت اور مشاہدہ کی قوت رکھتا ہے، وہ اپنے ہموطنوں اور معاصروں کے خد و خال، عادات و اطوار، افعال و اعمال کی تصویر ایسی صفائی کے ساتھ کھینچتا ہے جیسے کوئی کچھ آئینے میں دیکھ رہا ہے اس لحاظ سے یہ کتاب ایشیا کی تاریخی تالیفات میں اپنی مثال آپ ہے، ایشیا کے عام مورخین اکابر کے اعمال و حرکات کا ذکر تو پرشکوہ طریقہ پر کرتے ہیں، لیکن ان کے عادات و اطوار کو نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ اور دوسرے لوگوں کا ذکر مطلق نہیں کرتے

[1] تاریخ ہند، ہنری الیٹ ج ۴ ص ۲۲۰، ۲۱۸

ہیں لیکن بابر ہر فرد کی شکل و صورت، پوشاک، طور اور طریقے اس خوبی اور سچائی کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ہم اپنے کو ان اشخاص کے درمیان کھڑا پاتے ہیں، اور ان کی تمام سیرت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔"[1]

ایس۔ ایم۔ اڈورڈس نے بابر نامہ کو St. Augustine اور روسو کی Confession اور گبن اور نیوٹن کی Memoirs کے ہم پلہ قرار دیا ہے[2]
اس کا خیال ہے کہ یہ کتاب شروع سے آخر تک حق، صداقت اور راستبازی پر مشتمل ہے، اس عہد کے مشرقی اہل قلم زیادہ تر مرصع، مسجع اور پر تکلف عبارت لکھنے کے عادی تھے، لیکن بابر نے اپنی سادہ فطرت کے لحاظ سے سادہ طرز تحریر بھی اختیار کیا۔ اس کا ذہنی کمال یہ ہے کہ وہ چند الفاظ میں کسی شخص کی سیرت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتا ہے، ہرات کے سلطان حسین مرزا، پھر سلطان احمد مرزا، اور اپنے باپ کے درباری امراء کی جو قلمی تصویر پیش کی ہے وہ بہت ہی خوب اور قابل تحسین ہے،[2]
ایک اور انگریز اہل قلم لکھتا ہے کہ بابر نامہ پڑھنے کے بعد غیر ارادی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ بابر کا سینہ محبت، شفقت اور اُنس سے لبریز تھا، اس کی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے اس نے عسرت میں بھی دن گذارے، اور شان و شوکت کے ساتھ شاہی تخت پر جلوہ افروز بھی ہوا، مگر اس کے طبعی ذوق میں تبدیلی کسی حال میں نہیں ہوئی، دربار کی پر شکوہ آرائش میں بھی اپنے بچپن کے ساتھیوں کو نہیں بھولا، ان میں سے بعض کو یاد کر کے اشکبار بھی ہوا، ان کی باتوں کا حوالہ اکثر دیا کرتا تھا، ان کے ساتھ بچپن میں جو کھیل کھیلتا تھا، یا جو پر لطف مجلسیں ہوتی تھیں، ان کو بار بار اپنی تحریروں میں دہراتا ہے، وہ اپنی ماں اور گھر کی عورتوں سے دور رہنے کے باوجود اپنی تزک

---

[1] Life of Baber by W. Erskine ص ۵۲۲
[2] Baber: Diarist and Despot by S. M. Edwardes باب چہارم

میں ان کا ذکر اس طرح کرتا ہے جیسے وہ ان کے ارد گرد بیٹھا ہو۔[1]

تزک بابری کی مقبولیت اور اہمیت کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ تمام اہم زبانوں میں اسکے ترجمے ہوئے، اکبر کے حکم سے عبد الرحیم خاں خانخاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، ایک فرانسیسی اہل قلم M. pavel de. Courteille نے اس کو فرانسیسی میں منتقل کیا، Erskine اور Leyden دونوں نے مل کر اور پھر Mrs. A. D. Beveridge نے اس کو انگریزی جامہ پہنایا، موخر الذکر نے اپنے ترجمہ میں اتنے مفید حواشی اور ضمیموں کا اضافہ کیا ہے کہ بہت کم کتابوں کو یہ خوبیاں میسر ہوئی ہونگی، روس کی اورینٹیل اکیڈمی نے روسی زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے، اردو قالب میں اس کو مرزا نصیر الدین حیدر گورگانی المتخلص بہ فانی نے تبدیل کیا،

بابر کی شاعری بابر ایک اعلیٰ قسم کا ادیب ہونے کے ساتھ ترکی زبان کا ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، مرزا حیدر دوغلت مؤلف تاریخ رشیدی کا بیان ہے کہ میر علی شیر بیگ نوائی کے بعد ترکی شاعروں میں کوئی اور بابر کا مد مقابل اور ہمسر نہ تھا، فرشتہ رقمطراز ہے کہ

"در علم موسیقی و شعر و انشاء و املا نظیر نداشت"[2]

اکبر نامہ میں ہے:

"آں حضرت را در نظم و نثر پایۂ عالی بود، خصوصاً در نظم ترکی، و دیوان ترکی آں حضرت در نہایت فصاحت و عذوبت واقع شدہ، و مضامین تازہ در آں مندرج است"[3]

بابر کا ایک **دیوان** شاہی کتب خانہ رامپور میں موجود ہے، اس دیوان کے علاوہ اس نے

---

[1] الفنسٹن، تاریخ ہندوستان ج ۲ صـ ۱۱۶-۱۱۷

[2] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۱۱ [3] اکبر نامہ ج ۱ ص ۱۱۸،

۹۲۸ھ میں ترکی زبان میں ایک مثنوی مبین بھی اپنے لڑکے کامران کے لیے لکھی جس میں مذہبی، فقہی اور اخلاقی مسائل پر دو ہزار اشعار ہیں، اسی لیے یہ درفقہ مبین اور فقہ بابری کے نام سے بھی موسوم ہے، اس کی ایک شرح بھی شیخ زین نے لکھی تھی[۱]، بابر کی منظوم تالیفات میں ایک رسالہ **والدیہ** بھی ہے، یہ رسالہ اس کے استاد اور مرشد خواجہ عبید اللہ احراری کی تصنیف ہے، بابر نے ترکی میں اس کا منظوم ترجمہ کیا، جن حالات میں اس نے یہ رسالہ ہندوستان کے قیام کے زمانہ (۹۳۵ھ) میں ترجمہ کیا ہے وہ خود اس کی زبان سے سننے کے لائق ہیں

جمعہ کے دن تیئیسویں تاریخ جسم میں ایسی حرارت معلوم ہوئی کہ جمعہ کی نماز مسجد میں مشکل سے پڑھی گئی، ظہر کے بعد احتیاطاً کتب خانہ میں گیا، بہت دیر تک بیٹھی رہی، دوسرے دن ہفتہ کو بخار ہوا، کچھ جاڑا بھی چڑھا، سہ شنبہ ستائیسویں صفر کی رات کو دل میں آیا کہ خواجہ عبید کے رسالہ والدیہ کو نظم کروں، حضرت خواجہ کی روح سے ملتجی ہوا، اور دل میں دعا کی کہ یہ نظم آنحضرت کو مقبول ہو، اس کے قبول ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح قصیدہ بردہ مقبول ہوا اور اس کا کہنے والا مرض فالج سے اچھا ہو گیا، اسی طرح میں بھی تندرست ہو جاؤں، اسی نیت سے وزن رمل، مسدس مخبون وضرب کبھی ابتر کبھی مخبون محذوف میں جس میں مولانا عبد الرحمٰن جامی کا سبحہ بھی ہے، رسالہ نظم کرنا شروع کیا، اسی رات میں نے تیرہ شعر لکھ ڈالے، بطریق الزام ہر روز دس بیتوں سے کم نہ لکھیں، شاید کوئی دن ناغہ ہوا ہو، پچھلے سال بھی اور کئی بار اور بھی یہ بخار کم سے کم چالیس دن تک رہا ہے، خدا کی عنایت اور حضرت خواجہ کی برکت سے جمعرات کے دن انتیسویں کو ذرا افاقہ ہو گیا، اور پھر صحت ہو گئی، ہفتہ کے دن ربیع الاول کی آٹھویں تاریخ نظم تمام ہو گئی، ایک دن باون شعر ہوئے[۲]

[۱] بابر نامہ مرتبہ حمید ... جلد ۱ ص ۲۴۰، [۲] تزک بابری اردو ص ۳۳۶

بابر نے رسائل عروض کے نام سے ترکی شاعری کے عروض پر بھی ایک کتاب لکھی، [1] اسکا سنہ تالیف شاید ۹۳۳ء ہے، [2]

بابر نے اپنے تاثرات کا اظہار فارسی اشعار میں بھی کیا ہے، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے پھر بھی جو کچھ ہیں ان کو اساتذۂ فن نے نگاہ تحسین سے دیکھا ہے، ابوالفضل نے اکبرنامہ میں لکھا ہے، کہ "ہمچنیں بزبان فارسی نیز اشعار دلپذیر دارند" (جلد اول ص ۱۱۸)، تزک بابری اور دوسری کتابوں میں جو اس کے فارسی اشعار ملے ہیں ان کو ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں،

۹۱۵ھ میں بابر نے اپنے ہم جلیس خواجہ کلاں کو بجور کے قلعہ کی نگرانی کے لیے بھیجدیا، اسکی جدائی سے پریشان ہوا تو اس کے جانے کے دو ایک روز بعد یہ قطعہ لکھ کر اس کے پاس بھیجا،

قرار عہد بیار این چنیں نبود مرا	گزید ہجر و مرا کرد بے قرار آخر
بہ عشوہ ہائے زمانہ چہ چارہ سازد کس	بجور کرد جدا یار زار یار آخر

قلعہ بجور کے نام کی رعایت سے آخر شعر میں لفظ بہ جور نے قطعہ کو پرلطف بنا دیا ہے،

پانی پت کی لڑائی کے موقع پر بابر غیر ملکی ماحول سے پریشان تھا، اجنبی حریف کی اجنبی زبان سے اس کے ساتھی بھی کچھ بد دل تھے۔ گھبرا کر اس نے ایک شعر کہا

شدہ جمعے و بود جمعے پریشاں	گرفتار قومے و قومے عجائب

بیانہ کے قلعہ کی تسخیر کے موقع پر بابر نے اس کے حاکم نظام خان کو وعدہ وعید کے فرمان بھیجے، اور اس فرمان پر فی البدیہ یہ قطعہ بھی لکھ بھیجا جس میں بیانہ اور بیان کی رعایت لفظی ملاحظہ ہو،

باترک ستیزہ مکن اے میر بیانہ	چالاکی و مردانگی ترک عیان است
گر زود نیائی و نصیحت نہ کنی گوش	آنجا کہ عیان است چہ حاجت بہ بیان است

---

[1] طبقات اکبری ج ۲ ص ۲۷، [2] بابرنامہ ترجمہ مسز بیوریج ضمیمہ جات ص ×ل ج ۲،

۹۳۴ھ میں بابر نے چندیری فتح کیا، تو اس فتح کی تاریخ کا مادہ "فتح دارالحرب" نکلا، بابر نے اسکو یوں موزوں کیا،

بود چندے مقام چندیری | پُر ز کفار و دار حربی ضرب
فتح کردم بحرب قلعۂ او | گشت تاریخ فتح دارالحرب[۱]
۹۳۴

تزک بابری میں جابجا ایسے فارسی اشعار ہیں جن پر گمان ہوتا ہے کہ وہ بابر ہی کے ہیں، مگر ان پر کامل وثوق نہیں، اس لیے ان کو یہاں نقل کرنے سے ہم گریز کرتے ہیں، تاریخ فرشتہ میں ہے کہ بابر نے کابل میں ایک مرغزار میں پتھر کا ایک حوض کھدوایا تھا، یہاں اپنے خوش طبع دوستوں کے ساتھ عیش و عشرت کی بزم منعقد کرتا تھا، اسی مناسبت سے ایک شعر کہکر حوض پر کندہ کرایا تھا، وہ شعر یہ ہے:

نوروز و نو بہار مے و دلبرے خوش است
بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست[۲]

یہ شعر آج بھی پر کیف مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے، تاریخ فرشتہ میں بابر کا یہ شعر بھی منقول ہے:

باز اے ہمائے کہ بے طوطی خطت | نزدیک شد کہ زاغ برد استخوان من

ابوالفضل کو بابر کے یہ دو مطلع بہت پسند تھے،

ہلاک میکندم فرقت تو دانستم (۱) | وگرنہ رفتن ازیں شہر می توانستم
تا بزلف سیہش دل بستم (۲) | از پریشانی عالم رستم

اکبر نامہ میں بابر کی یہ رباعی بھی منقول ہے،

درویشاں را گرچہ نہ از خویشانیم | لیک از دل و جاں معتقد ایشانیم

[۱] تزک بابری اردو ترجمہ ص ۲۲۳، ۲۹۴، ۲۲۰، ۳۷۴، [۲] فرشتہ ج ۱ ص ۲۱۱،

دور است مگوی شاہی از درویشے   شاہیم ولے بندۂ درویشانیم[1]

درویشوں سے بابر کی یہ عقیدت اس ذوق و تصوف کی بنا پر تھی جو اس نے اپنے مرشد حضرت خواجہ عبید اللہ کی صحبت میں حاصل کیا، چنانچہ شیخ کے وصال کے بعد شیخ کا تصور کر کے کہتا ہے :-

در ہوائے نفس گمرہ عمر ضایع کردہ‌ایم   پیش اہل اللہ ز افعال خود شرمندہ‌ایم

یک نظر با مخلصان خستہ دل فرما کہ ما   خواجگی را ماندہ‌ایم و خواجگی را بندہ‌ایم

حسب ذیل دو شعر میں بابر یا تو اپنے مرشد کی طرف سے مذکورۂ بالا اشعار کا جواب دیتا ہے یا اپنے شیخ کو پھر مخاطب کرتا ہے،

اخلاص و عقیدۂ تو روشن شدہ است   حالات و طریقہ‌ات مبرہن شدہ است

حایل چو نماند زود برخیز و بیا   دل خواہ تو تربیت معین شدہ است

تذکرۂ مراۃ الخیال (ص ۹۸) میں بابر کی یہ غزل منقول ہے

در دور ما ز کہنہ سواران یکے مے است   واں کو دم از قبول نفس می زنند نے است

ایں سلطنت کہ ما ز گدایش یافتم   دارا نداشت ہرگز و کاؤس را کے است

دانی کمان ابروے جانان سیہ چرا است   کز گوشہاش دود دل خلق در پے است

دارد بزلف او دل زنار بند ما   سودائے کفر و کافری و ہر چہ در وے است

بابر رسید نالہ ز زارت بگوش یار   مجنوں وقوف یافت کہ لیلی دریں مے است

بابر نے اپنی ایک بزم ادب کی بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز تصویر کھینچی ہے،

نماز سے پہلے یدہ سرا میں آئے، آفتاب نکلے لشکر والے سیر کرتے ہوئے آنے شروع

---

[1] اکبر نامہ ج ۱ ص ۱۱۹، ۱۱۸،

ہوئے، یہ لوگ دور دراز سے فریق اریق میں ٹھیرے ہوئے تھے، مگر ہم کو نہ دکھائی دیے، جلسہ میں اکثر وہ لوگ تھے جو شعر کہتے تھے، جیسے شیخ ابوالوحید، شیخ زین ملا علی خاں، نردی بیگ، اور خاکسار وغیرہ۔ اثنائے صحبت میں محمد صالح کا یہ شعر پڑھا گیا،

محبوبی ہر عشوہ گرے را چہ کند کس — جائیکہ تو باشی دگرے را چہ کند کس

فرمایش کی کہ اس زمین میں کچھ شعر کہو، شاعر اور موزوں طبع فکر کرنے لگے۔ ملا علی خاں سے بہت ہنسی کھلی ہوتی تھی، ہنسی سے میں نے فی البدیہ یہ شعر کہا ؎

مانند تو مدہوش گرے را چہ کند کس — نرگاؤ کسے مادہ خرے را چہ کند کس

پہلے اس سے جو کچھ اچھا برا کہتے یا ہزل نظم کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو لکھ لیا جاتا تھا جب سے مبین کو نظم کرنے لگا تو دل میں آیا کہ جس زبان سے یہ پاک الفاظ نکلیں حیف ہے کہ اس سے بیہودہ لفظ بھی نکلیں، اور جس دل میں ایسے مقدس مضامین کھلیں، افسوس ہے کہ اس میں ایسے ناپاک خیال بھی پیدا ہوں، اسی دن سے ہزل کہنا ترک کر دیا تھا، اس شعر کے کہتے وقت اصلاً خیال نہ رہا، دو ایک روز کے بعد بگرام میں آکر مجھے جاڑے سے بخار چڑھا، کھانسی بھی ہوگئی، اور کھنکار میں خون آنے لگا، اب میں سمجھا کہ یہ تنبیہ کس طرف سے ہے اور یہ تکلیف کیوں ہے، فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهِ فَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۔۔۔۔۔۔ میں نے بار دگر توبہ کی اور اس نالائق طرز سے دل ہٹا لیا، سچ یہ ہے کہ کسی گنہگار بندہ کے دل میں ایسے خیال کا پیدا ہونا ایک بڑی دولت ہے، جو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے، جو بندہ اس طرح متنبہ ہو جائے وہ اس کو سعادت عظمیٰ سمجھے، (ص ۵۴، ۲۵۳)،

خط بابری — بابر نے اپنی جودت طبع سے ایک خاص قسم کا خط اختراع کیا، جو شاید خط نسخ کی ایک

شکل تھی، اسی خط میں ایک کلام مجید لکھکر مکہ معظمہ بھیجا، منتخب التواریخ میں ہے:۔

واز جملہ غرایب واختراعات آن شاہ مغفرت پناہی خط بابریست کہ مصحفی بدان خط نوشتہ و بمکہ معظمہ فرستادہ۔[1]

تزک بابری میں اس خط کا جا بجا ذکر ضرور ہے، مگر کہیں اس کی تفصیل نہیں، بابر نے اس خط کو ۹۱۰ھ میں ایجاد کیا، مگر اس کا لکھنا آسان نہ تھا، اس لیے مقبول نہ ہوا، ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ عہد اکبری میں یہ خط مفقود ہو چکا تھا، مگر خوشنویسی کے اساتذہ اس خط میں لکھنا کمال فن سمجھتے تھے، اکبر کے دور حکومت میں میر عبد الحئی مشہدی اس خط کا باکمال استاد تھا۔

بابر کے دربار کے فضلاء و شعراء

بابر نے جن ارباب علم سے بالواسطہ یا بلا واسطہ استفادہ کیا، ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، ان کے علاوہ اس کے دربار میں ممتاز فضلاء و شعراء کی بھی ایک جماعت تھی، جو برابر اس کی معیت میں رہتی تھی، ان میں سے بعض کے مختصر حالات ہم یہاں پر درج کرتے ہیں،

شیخ زین الدین۔ "صدر" کے عہدہ پر فائز تھے، معقولات و منقولات میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، واقعات بابری کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، بابر ان کی فارسی انشاء پردازی کا معترف تھا، اس نے جب رانا سانگا پر فتح پائی تو اس خوشی میں مسلمانوں سے محصول لینا معاف کر دیا، اس کے لیے شیخ زین ہی نے فرمان لکھا، جو تمام قلمرو میں بھیجا گیا، اس فتح پر بابر نے شیخ زین سے ایک فتحنامہ بھی لکھایا، اس سے بابر کی فوج کی کیفیت، ہندوؤں کے لشکر کی حالت، اور دونوں کی صف آرائی اور معرکہ آرائی کے طریقے مفصل طور سے معلوم ہوتے ہیں، بابر نے دونوں فرامین کو اپنی تزک میں شامل کر دیا ہے، شیخ زین نے بابر کی مثنوی مبین

[1] منتخب التواریخ مولفہ عبد القادر بدایونی جلد اول ص ۳۴۳، [2] ایضاً جلد سوم ص ۲۷۳،

کی ایک شرح بھی لکھی، بابر کی فتح ہندوستان کے متعلق ایک تاریخ بھی قلمبند کی، وفائی تخلص رکھتے تھے، منتخب التواریخ میں ان کے اشعار درج ہیں، جن میں دو رباعیاں یہ ہیں،

(۱)
آرمیدی برقیبان و رمیدی از ما ... ما چہ کردیم و چہ دیدی چہ شنیدی از ما
بر حال بردن ما حاجت بیداد نبود ... می سپردیم اگر می طلبیدی از ما

(۲)
غم گریباں گیر شد سر در گریباں چوں کشم ... شوق دامنگیر آمد پا بداماں چوں کشم
اے گریبانم ز شوقت پارہ دامن چاک چاک ... بے تو پا در دامن و سر در گریباں چوں کشم

بابر کی وفات سے تین سال پہلے ۹۳۴ھ میں بمقام اکبرآباد عالم جاودانی کو سدھارے، وہاں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، اسی کے احاطہ میں دفن کیے گئے، ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ

صاحب کمالات صوری و معنوی بود و در معما و تاریخ و در بدیہہ یافتن و شعر و سائر جزئیات نظم و نثر و انشاء بے قرینۂ زمان خود بود۔[۱]

بابر کے دربار کے ممتاز فضلا میں مولانا **بقائی** بھی تھے، ایک مثنوی مخزن کی زمین میں لکھکر بابر کی خدمت میں پیش کی،

مولانا **شہاب الدین** علم و فضل، شعرگوئی خصوصاً معماگوئی میں بلند پایہ رکھتے تھے، کلام پاک اور حدیث پر ان کی نظر وسیع تھی، شاعر بھی تھے، تخلص حقیر تھا، شاعری کے کچھ نمونے منتخب التواریخ (مولفہ عبدالقادر بدایونی) کی جلد اول (ص ۳۴۲) میں ملیں گے، ۹۴۲ھ میں وفات پائی، میر آخوند نے "شہاب الثاقب" سے تاریخ وفات نکالی ہے،

شاعروں میں شیخ ابوالوجد فارغی، سلطان محمد کوسہ، سرخ وداعی، شیخ جمالی کہنہ مشق تھے، اطبا میں میر ابوالبقا، مولانا یوسفی اور خواجہ نظام الدین علی خلیفہ اپنے علم کے لیے مشہور تھے،[۲]

---

۱ منتخب التواریخ ج ۱ ص ۴۷۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۱، نیز دیکھو صبح گلشن مولفہ نواب سید علی حسن خان ص ۵۹۲ ۲ اکبرنامہ ج ۱ ص ۱۱۹،

یہ تمام ارباب کمال بابر کی علم نوازی کا حال سنکر خراسان، ہرات اور دوسری جگہوں سے ہندوستان آئے تھے، بابر بھی ان کی پذیرائی اور سرپرستی پورے شاہانہ انداز سے کرتا تھا، ۹۳۵ھ میں گوالیار کی مہم میں سخت بیمار ہوگیا، بیماری سے شفا پائی تو ایک جشن عشرت منعقد کیا، اس جشن میں تمام ایلچی قزلباش، اوزبک اور ہندو بھی شریک ہوئے، بابر نے ان سب کو ترازو کے پلڑے بھر بھر کر چاندی اور سونا دیا، اس موقع پر بھی سادات اور علما، کو فراموش نہ کیا، اس جشن کا ذکر کرتے ہوئے فرشتہ لکھتا ہے:۔

> دوسرے حقداروں اور سادات کو بھی اپنی بخشش سے فیض پہنچایا، اخوند میر مؤلف حبیب السیر اور مولانا شہاب الدین معمائی اور مرزا ابراہیم قانونی جو اپنے فن کے بے نظیر استاد تھے، اور ہرات سے ہندوستان میں تازہ وارد ہوئے تھے، اس جشن عشرت میں بادشاہ کی ملازمت سے سرفراز ہو کر شاہی نوازشوں سے مالامال کئے گئے، اور جملہ مقربوں میں داخل ہوئے، (ج ۱ ص ۲۱۰)

اخوند میر کا ذکر آگے آئے گا،

کتب خانہ بابر سفر اور حضر دونوں میں کتب خانہ ساتھ رکھتا تھا،[۱] ۹۳۰ھ میں بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا، تو لاہور کے پاس غازی خاں سے متصادم ہوا، غازی خاں کو شکست ہوئی، تو بابر اس کے قلعہ میں داخل ہوا، جہاں اس کو بے شمار دولت ملی، لیکن بابر کے لیے رب سے قیمتی سرمایہ غازی خاں کا کتب خانہ تھا، غازی خاں بڑا علم دوست تھا، جید عالم ہونے کے علاوہ شاعری کا بھی اعلیٰ مذاق رکھتا تھا، اس نے ہر قسم کی عمدہ اور خوش خط لکھی ہوئی کتابیں اپنے کتب خانہ میں جمع کر رکھی تھیں، بابر نے ان کتابوں میں سے کچھ اپنے لیے مخصوص کر لیں، کچھ شہزادہ ہمایوں کو دیں، اور کچھ شہزادہ کامران کے لیے کابل روانہ کیں،[۲]

[۱] تزک بابری اردو صفحہ ۳۰۳
[۲] تاریخ فرشتہ ج ۱ صفحہ

ہُمایوں

ہمایوں ۹۱۳ھ ماہ ذیقعدہ میں کابل میں پیدا ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بابر اپنی قوت واقتدار کی خاطر ایک مقام سے دوسرے مقام کو پریشان حال پھر رہا تھا، کبھی باپ کی متروکہ مملکت سے محروم ہوکر پہاڑوں کی برفانی چٹانوں پر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا نظر آتا ہے، کبھی برف کاٹ کر فوج کے لیے راستہ بناتا ہوا دکھائی دیتا ہے، کبھی اپنی جودت جہانگیری سے کابل کا بادشاہ بن بیٹھتا ہے، تو کبھی عزیزوں اور دوستوں کی کج ادائیوں سے اسی شہر کی گلیوں میں برہنہ پا پھرتا دکھائی دیتا ہے،

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنی اولاد کی تعلیم خاطر خواہ نہ دلا سکا ہوگا، پھر بھی یہ عجیب بات نظر آتی ہے، کہ اس کی تمام اولاد علم وہنر سے مالا مال تھی، جیسا کہ آگے ذکر آئیگا،

ہمایوں کی تعلیم وتربیت

ہمایوں کی تعلیم وتربیت کے متعلق کوئی مستقل بیان موجود نہیں، اس کی پیدائش کے تھوڑے دنوں کے بعد تزک بابری کی تحریر کچھ عرصہ تک بند رہتی ہے، جو ہمایوں کی طفولیت اور تعلیم وتربیت کا زمانہ ہے، اس لیے بابر اس کے متعلق لکھنے سے قاصر رہا، تاریخوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں جب چار سال چار مہینہ اور چار روز کا ہوا تو رسم مکتب کی تقریب ادا کی گئی، اس کے اتالیق خواجہ کلاں اور شیخ زین الدین رہے، جو بابر کے درباری امرا، میں سے تھے، اس کی تعلیم کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملتے مگر

بابرنامہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر کی تالیفات اس کی اولاد کے زیر مطالعہ رہیں، ذکر آچکا ہے کہ بابر نے اپنی مثنوی مبین کامران کی تعلیم کی غرض سے لکھی تھی، بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے کہ ہمایوں کو بھی جو کامران سے صرف ایک یا دو سال عمر میں بڑا تھا، اس مثنوی کے ذریعہ سے مذہب واخلاق کا درس نہ دیا گیا ہو، تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ مذہب و اخلاق میں ہمایوں کی تربیت اعلیٰ قسم کی ہوئی تھی، وہ صوم وصلوٰۃ کا سخت پابند تھا، کبھی وہ قسم نہ کھاتا اور نہ کبھی فحش لفظ زبان پر لاتا تھا، کسی سے بہت خشمگیں ہوتا تو صرف لفظ سفیہ کہہ دیتا، معمولی احکام شرعی پر اس سختی سے عمل کرتا کہ مسجد میں کبھی پہلے بایاں پاؤں اندر نہ رکھا، اور حسن ادب یہاں تک تھا کہ بے وضو خدائے عزوجل کا نام کبھی نہیں لیا[۵]، ممکن ہے کہ یہ مذہبی اور اخلاقی جلا باپ ہی کی تربیت اور اس کی تالیف کردہ مثنوی کے ذریعہ سے پیدا ہوئی ہو،

بادشاہ بنکر ہمایوں نے جو علمی مذاق کا ثبوت دیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم ویسی ہی ہوئی تھی جو ایک شہزادہ کے لیے ضروری ہوتی ہے، تمام معاصر مورخین اس کو ایک بلند پایہ شاعر اور علم ریاضی وہیئت کا ماہر و عالم بتاتے ہیں،

ہمایوں کی سخن سنجی و سخن فہمی اس کے اعلیٰ علمی مذاق کا ادنی ثبوت یہ ہے کہ اس کی تمام زندگی جنگ و جدل میں گذری، پھر بھی فرصت کے اوقات میں شعر و سخن کا شغلہ جاری رکھا، گو اس کی مادری زبان ترکی تھی، مگر اس نے اشعار فارسی ہی میں موزوں کیے، اس کے ذوق شعر و شاعری کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں،

ہمایوں جب شیر خاں سے شکست کھا کر بے وفا بھائیوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے لاہور پہنچا، تو مرزا کامران نے بہ ظاہر موافقت اندر پردہ مخالفت کی، شیر خاں آگے بڑھتا چلا آرہا تھا،

---

[۵] بدایونی ج ۱ ص ۴۶۸،

کامران نے اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے خفیہ طور پر اس سے سازش کرلی، کہ شیر خان پنجاب لیکر اسے کابل، قندھار، اور غزنی کا تنہا مالک بنا کر چھوڑ دے، اور ظاہرا ہمایوں سے شیر خاں کے خلاف جنگ کرنے کی تدبیروں کے متعلق مشورے کرتا رہا، یہانتک کہ شیر خاں بہت ہی قریب پہنچ گیا، اور ہمایوں کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجا، مرزا کامران نے شیر شاہ کے قاصد کا پرجوش استقبال کیا، اور اس کی آمد میں بڑا جشن منایا، ہمایوں نے اس موقع پر ایک رباعی کہی،

در آئینہ گرچہ خود نمائی باشد　　پیوستہ ز خویشتن جدائی باشد

خود را بمثال غیر دیدن عجب است　　ایں بوالعجبی کار خدائی باشد

اور اس کو مرزا کامران کے پاس بھیجدیا، گلبدن بیگم کا خیال ہے کہ ہمایوں نے کامران کے پاس ؤہ رباعی نہیں بھیجی، بلکہ قاصد کے ذریعہ سے شیر خان کے پاس ارسال کی،[۱]

ہمایوں شیر خان سے ہزیمت اٹھانے کے بعد پریشان حال پھر رہا تھا، کہ اپنی پسماندہ فوج کے ساتھ جیسلمیر پہنچا، وہاں کے بیابان میں پانی کی کمی کی وجہ سے لشکری پیاس سے مرنے لگے، بمشکل ایک کنواں نظر آیا، مگر اس کنوئیں پر پانی کے لیے لشکریوں میں ایسا جھگڑا ہوا کہ بہت سے فوجی کنوئیں میں گر کر ہلاک ہو گئے، ہمایوں نے اسی وقت یہ شعر کہا

چناں زد چاک گردوں لباس دردمنداں را　　کہ نے دست آستیں می یابد و نے سر گریباں را[۲]

ہمایوں ایسے موقعوں پر بہت متاثر ہو کر اشعار کہتا تھا، اور جب کبھی اپنے حال کے موافق کوئی شعر سنتا تو بے اختیار ہو جاتا تھا، جب ہندوستان کا تخت و تاج کھو کر شاہ طہماسپ کی دعوت پر ایران جارہا تھا تو ہرات میں سلطان محمود مرزا نے اس کا استقبال کیا، اور خاص طور پر جشن شاہانہ مرتب کیا، صابر قاقی نے جو خراسان کا مشہور گویا تھا، ایک غزل گانا شروع کیا، جس کا مطلع یہ تھا،

---

[۱] ہمایوں نامہ، گلبدن بیگم، ص ۴۰ [۲] بدایوں ج ا ص ۴۲۹،

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد   ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہی چنیں باشد

جب وہ اس شعر پر پہنچا،

زرنج و راحتِ گیتی مرنجاں دل مشو خرم   کہ آئین جہاں گاہے چناں گاہی چنیں باشد

تو ہمایوں کے دل پر ایک سخت چوٹ لگی، اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے[1]،

ہمایوں نے جب سنہ ۹۵۰ھ میں ایران کی طرف رخ کیا تو شاہ طہماسپ صفوی کو ایک رقعہ لکھا، جس میں یہ اشعار سپرد قلم کئے،

خسروا عمریست تا عنقای عالی ہمتم   قلۂ قاف قناعت را نشیمن کردہ است

روزگار سفلۂ گندم نمای جو فروش   طوطی طبع مرا قانع بارزن کردہ است[2]

دشمنم شیریست اما پشت برمن کردہ بود   این زماں از ضعف طالع رُو بمن کردہ است[3]

التماس از شاہ آن دارم کہ با من آن کند[4]   انچہ با سلمان علی در دشت ارذن کردہ است

اس کے ساتھ یہ رباعی بھی تھی

اے شاہ جہاں کہ نہ فلک پایۂ تست   در دست ولایت ہمہ سرمایۂ تست

شاہان جہاں جملہ ہمای طلبند   بنگر ہما چگونہ در سایۂ تست

شاہ ایران نے اس کے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا،[5]

ہمای اوج سعادت بدام ما افتد   اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

۱؎ مآثر رحیمی ج ا ص ۵۰۰، کلکتہ، اکبر نامہ ج ا ص ۲۱۴، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، ۲؎ روز روشن (مولفہ نواب صدیق حسن) میں یہ مصرع اس طرح درج ہے، این زماں از ناحفاظی رُو بمن کردہ است ۳؎ مخزن الغرائب ۴، دارم استدعا ز شاہنشہ کہ با من آن کند، ۴؎ مخزن الغرائب ا ر جن، بدایونی، ج ا، ص ۴۵،

۵؎ اکبر نامہ ج ا، ص ۲۰۵،

ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ ہمایوں جب ایران پہنچا تو اس نے شاہ ایران کو ایک رباعی پھر لکھ بھیجی، جس کا ایک شعر شاید شاہ ایران کے مذکورہ بالا شعر کا جواب تھا،

شاہاں ہمہ سایۂ ہمامی خواہند　　بنگر کہ ہما آمدہ در سایۂ تو[۱]

شاہ طہماسپ نے ہمایوں کا پرجوش خیر مقدم کیا اور بھائی بنا کر اپنے یہاں رکھا، مگر امیروں اور درباریوں کو یہ بات ناگوار گذری، اور رفتہ رفتہ شاہ کے کان بھر کے ہمایوں کو اس سے برگشتہ کر دیا، ہمایوں مصیبت کا مارا تھا، بیرم خاں کی صلاح کے موافق احتیاط کو مدنظر رکھا، اسی دوران میں شاہ طہماسپ کی بہن سلطانہ بیگم اور قاضی جہاں قزوینی اور حکیم نورالدین ایسے حاشیہ نشینوں نے باہم یک رائے ہو کر یہ کوشش شروع کی کہ شاہ کے دل سے غبار کدورت دور ہو جائے، چنانچہ ایک روز سلطانہ بیگم نے ہمایوں کی یہ رباعی پڑھ کر سنائی،

ہستیم زجاں بندۂ اولاد علی　　ہستیم ہمیشہ شاد بایاد علی

چوں سر ولایت زعلی ظاہر شد　　کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علی

شاہ طہماسپ اس رباعی کو سن کر بے حد خوش ہوا، اور ہمایوں کی جانب سے اس کے دل کی کدورت جاتی رہی،[۲]

اسی غریب الوطنی کے زمانہ میں ہمایوں نے تبریز کی سیر کی، عہد ماضی کے آثار قدیمہ اور سیر گاہیں دیکھیں، ان کو دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا، اور اس وقت یہ رباعی پڑھی،[۳]

افسوس کہ سرمایہ بکف بیروں شد　　در دست اجل بے جگرہا خوں شد

کس نامد ازاں جہاں کہ تا پرسم ازو　　کاحوال مسافران عالم چوں شد

---

[۱] بدایونی ج ۱ ص ۴۵۵، [۲] فرشتہ ص ۲۱۱، [۳] اکبر نامہ ص ۲۲۰،

ہمایوں کی قسمت نے جب ایک بار پھر ساتھ دیا تو وہ از سرِ نو فوج ترتیب دے کر کامران کے خلاف قندھار پر حملہ آور ہوا، اس وقت ہمایوں کا رفیق بیرم خان قلعہ قندھار کے محاصرہ میں ساتھ تھا، قلعۂ قندھار بہت ہی مستحکم تھا، اس کی دیوار کا عرض سات گز تھا، اس کو تسخیر کرنا آسان نہ تھا، لیکن بیرم خاں کی سپہگری اور جوانمردی سے آخر میں یہ فتح ہوا، ہمایوں نے اس مسرت میں ایک نظم کہی اور بیرم خاں کے پاس بھیجدی، وہ نظم حسب ذیل ہے،[1]

باز فتحے ز غیب روئے نمود | کہ دلِ دوستاں ازاں بکشود
شکر اللہ کہ باز شادانیم | بر رخ یار و دوست خندانیم
دوستاں را بکام دل دیدیم | میوۂ باغ فتح را چیدیم
روز نوروز بیرم است امروز | دل احباب بے غم است امروز
شاد بادا ہمیشہ خاطر یار | غم نہ گردد بگرد دیار و دیار
ہمہ اسباب عیش آمادہ است | دل بفکر و جہالت افتادہ است
گوش خرم شود ز گفتارت | دیدہ روشن شود ز دیدارت
در حریم حضور شاد بہم | بنشینم خرم و بے غم
بعد ازیں فکر کار ہند کنیم | عزم تسخیر ملک سند کنیم

ہمایوں نے اس مثنوی کے حاشیہ پر حسب ذیل رباعی بھی لکھی،

اے آنکہ انیس خاطر محزونی | چوں طبع لطیف خویشتن موزونی
بے یاد تو من نیم زمانے ہرگز | اما تو بیاد من محزوں چونی

بیرم خاں نے اس کے جواب میں یہ لکھ بھیجا،

---

[1] خافی خاں حصہ اوّل ص ۱۲۵

اے آنکہ بذات سایۂ بیچونی | از ہرچہ ترا وصف کنم افزونی
چوں میدانی کہ بے توچوں میگذرد | چوں می پرسی کہ در فراقم چونی[1]

بیرم خاں کے ایک خط کے جواب میں ہمایوں نے یہ رباعی کہی تھی،

اے یار لطیف طبع پاکیزہ گہر | وی عمدہ اہل فضل وارباب ہنر[2]
بکشای نظر امید کز نور حضور | می آرمت از تیرگی ہجر بدر

مقیم نامی ایک شخص کے متعلق اس نے حسب ذیل شعر کہا،

مقیم شد غم تو در دلم چہ چارہ کنم | عجب غنیمت اگر دل ز سنگ خارہ کنم[3]

ہمایوں کی وفات کے دن جب قریب آئے تو ایک روز اس نے کہا کہ آج صبح کی نماز کے بعد ملہم غیبی نے یہ رباعی سنائی،

یارب بکمال لطف خاصم گردان | واقف بحقائق خواصم گردان
از عقل جفا کار دل افگار شدم | دیوانۂ خود خوان و خلاصم گردان

اور اس کو پڑھ کر رونے لگا۔ ان دنوں ہمیشہ وہ کہتا کہ عالم فانی سے بوئے موت آتی ہے،
چنانچہ محل کے طاق پر شیخ آذری کا یہ مطلع نہایت خوشخط لکھا ہوا تھا،

شنیدہ ام کہ بریں طارم زر اندود است | خطے کہ عاقبت کار جملہ محمود است[4]

ظاہر ہے کہ ہمایوں کے شعر و سخن کے ذوق کے سبب اس زمانہ کے شعرا شاہی جود و کرم سے ہمیشہ فیضیاب ہوتے رہے ہوں گے، بدایونی کا بیان ہے،

"شعرائے بسیار نادرۂ روزگار از دامن او برخاستہ اند،،[5]

ہمایوں ان شعرا کو اپنی علم پرور صحبتوں میں ہمیشہ شریک رکھتا، اور شعر و شاعری کی مجلسیں

---

[1] مآثر الامراء ج ۱، ص ۳۷۲ [2] ریاض الشعراء قلمی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ [3] لطائف نامہ فخری ص ۳۱۲ شائع کردہ اورینٹل کالج، لاہور، [4] اکبر نامہ ص ۳۶۳، ۳۶۲ [5] بدایونی ص ۴۶۹ ج ۱،

برابر گرم رہتیں، ہمایوں کی نکتہ سنجی، دقتِ نظر اور معانی آفرینی کی جلا ان صحبتوں میں خوب ہوئی، جس کے باعث وہ اکثر اساتذہ کے کلام میں بلا تکلف اصلاحیں دیتا تھا، ایک بار ملا حیرتی نے اس کے سامنے یہ شعر پڑھا،

ہمچو پروانہ بشمعے سروکار است مرا — پس اگر پیش روم بال و پرم می سوزد

ہمایوں نے دوسرے مصرعہ میں یہ اصلاح دی،

می روم پیش اگر بال و پرم می سوزد

ملا حیرتی اس اصلاح سے بہت محظوظ ہوئے۔[۱]

جاہی تیمان نے شاہ محمد خاں شاپوروالی کابل سے ناراض ہو کر اس کی ہجو کہی، ہمایوں کے سامنے وہ ہجو پڑھی گئی:-

شاعر شاہ ہمایونم و خاک درگہ — می زندکو کبۂ شاعریم طعنہ بمہ

خسرو شوم و ابیات خوشم خیل و سپہ — دیدم از قحبہ زنی ظلم نہ جرم و نہ گنہ

پارۂ کاغذ اگر از ہذیاں گشتہ سیہ — سوئے ہجوش اگر اندیشہ شود رد و بہ

غرض آنست کہ ایں خر صفتان ابلہ — عزت و حرمت ایں طائفہ وا دانند نگہ

وائے آنست کہ بخیلِ شعرا بستیزد — ہر کہ با ما بستیزد بہ بلا بستیزد

آخری مصرعہ کو سنکر ہمایوں نے فی البدیہہ کہا کہ اس کو اس طرح پڑھو،

ہر کہ با ما بستیزد و بخدا بستیزد

ابوالفضل نے اکبرنامہ میں ہمایوں کی شاعری کے ذوق کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے

و توجہ عالی بہ شعر و شعرا نیز داشتند و ازانجا کہ طبع موزون از خصائص فطرت سلیم است

---

[۱] مآثر رحیمی ص ۶۱۲ ج ۱، و اکبرنامہ ج ۱ ص ۲۲۱

در خلالِ اوقات واردات قدسی را (چہ از حقیقت وچہ از مجاز) در سلک نظم می کشیدند و دیوان شعر آنحضرت در کتابخانہ عالی موجود است۔" (ج ۱ ص ۳۶۸)

ابوالفضل کو ہمایوں کی حسب ذیل رباعیاں پسند تھیں، اسی لیے اس نے اکبرنامہ میں ان کو نقل بھی کیا ہے،

(۱)
اے دل مکن اضطراب در پیش رقیب — حال دل خود مگوئے با ہیچ طبیب
کاریکہ ترا باآں جفا کار افتاد — بس قصہ مشکل است وبس امر عجیب

(۲)
اے دل ز حضور یار فیروزی کن — در خدمت او بصدق دلسوزی کن
ہر شب بخیال دوست خرم بنشیں — ہر روز بوصل یار نوروزی کن

(۳)
اے آنکہ جفای تو بعالم علم است — روزیکہ ستم نہ بینم از تو ستم است
ہر غم کہ رسد از ستم چرخ بدل — مارا چو غم عشق تو باشد چہ غم است

فرشتہ نے تاریخ فرشتہ میں ہمایوں کے دیوان سے اپنی پسند کی چند غزلوں کے یہ اشعار نقل کیے ہیں: (ص ۲۴۳ ج ۱)

گذشت از دل سرگشتہ ناوک ستمش — نماند بر من دلدادہ لذت المش
بقصد کشتن عشاق گرکند میلے — عجب نباشد از اخلاق وشیوہ کرمش
کراست زہرۂ قرب حریم حرمت او — کہ جبرئیل امیں نیست محرم حرمش
اگر بپرسش عشاق می نہد قدمے — ہزار جان گرامی فدائے ہر قدمش

ولہ

خوش آنکہ باخیالت عمری نشستہ بودم — وز شوق سرو قدت از جائے جستہ بودم
عیبم مکن کہ گفتم موئے ترا پریشاں — در شرح جعد زلفت پیوستہ بستہ بودم

درشرح غنچهٔ او ہرگز نگفتہ حرفے
لب را دراں حکایت پیوستہ بستہ بودم

حقا کہ چوں ہمایوں درحال وصل بیخود
با دوست در حکایت از خویش رفتہ بودم

ولہٗ

داغِ عشق تو بر جبین تن ست
خاتم لعل تو نگینِ من ست

تا نشستم چوں خاک بر در تو
پشتِ بام فلک زمین من ست

ہر کجا شاہ و شہریاری بود
ایں زماں بندۂ کمین من ست

خط مشکیں بصفحۂ گلفام
آیت رحمت مبین من ست

ولہٗ

من اشک رواں چو گنج قاروں دارم
گلگوں درون کیسہ زافیوں دارم

مختلف دور کے تذکرہ نگاروں نے ہمایوں کی سخن گستری کی داد دی ہے، اور اس کے پسندیدہ اشعار سے اپنے تذکروں کے صفحات مزین کئے ہیں، مرزا علاء الدولہ قزوینی نے نفائس المآثر (۹۷۳-۹۸۲ھ) میں ہمایوں کی حسب ذیل غزلیں اور ایک رباعی نقل کی ہے،

کار من باماہوشے افتادہ است (۱) در درونم آتشے افتادہ است

خانہ ام روشن شد از روئے حبیب
پرتوے زماہوشے افتادہ است

دل مرا اے جان بہر سوی کشد
تا دلم با دلکشے افتادہ است

کام دل خواہم گرفتن این زماں
چون بدستم سرخوشے افتادہ است

عقل و ہوش از من مجوئید اے ایں
چوں ہمایوں بیہشے افتادہ است

وصف لعل تو بر زبان منست (۲) آتشے در میانِ جانِ منست

هر کہ باشد بمجلس رندان　　بے خود از نعرہ و فغانِ منست
انچہ در وصف حسن او گویند　　جملہ در شرح و در بیانِ منست

رباعی

اے آنکہ زیاد تو دلم باشد شاد　　بے یاد تو خاطرم دمے شاد مباد
روزیکہ زیاد تو کنم صد فریاد　　آیا ز من غمزدہ است آید یاد [1]

سفینہ خوشگو مولفہ بندرابن میں یہ رباعی مرقوم ہے،

یارب کہ رضاے دل درویشان دہ　　ایں ریش دل شکستہ را درمان دہ
حدنیست کہ گویم ایں مدہ یا این دہ　　چیزے کہ رضاے تو در آنست آن دہ

ریاض الشعرا (۱۱۶۱ھ) میں علی قلی داغستانی نے منجملہ اوس اشعار کے ایک رباعی یہ بھی لکھی ہے :-

اینکہ فلک بقبضۂ قدرت اوست　　دادہ است ترا دو چیز کان ہر دو نکوست
ہم سیرت ہم آنکہ دوست داری کس را　　ہم صورت آنکہ ترا دارد دوست

روز روشن میں نواب صدیق حسن نے ہمایوں کی شاعری کا ذکر تین صفحوں میں کیا ہے، احمد علی سندیلوی مخزن الغرائب میں رقمطراز ہیں،

بادشاہ بود ملکی ملکات و بجمیع فضائل و کمالات صوری و معنوی آراستہ و در علوم ہیات و نجوم و سائر علوم عربیہ بے نظیر و مربی اہل فضل و کمال و مرجع اہل تقوی و صلاح و بشعر و شعرا مائل و خود شعر نیکو گفتے ،

[1] A History of persian Literature and Langage at The mughul court by A. Ghani.

مخزن الغرائب میں بہت سے اشعار منقول ہیں، ان میں سے دو شعر یہ ہیں،

دریا دلیم و دیدۂ ما معدن درست | کردست ماتہی است و لے چشم ما پر است

این نہ سرو است کہ در باغ قد افراختہ است | شمع سبز یست کہ پروانہ او فاختہ است

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ہمایوں صاحب دیوان بھی تھا، یہ دیوان کتب خانوں میں گم رہا، مگر اب یہ امر باعث مسرت ہے کہ استاذی المحترم جناب سید حسن عسکری صاحب زاد لطفہ (پروفیسر تاریخ، پٹنہ کالج، پٹنہ) نے اپنی مساعی جمیلہ سے یہ دیوان اپنے وطن مالوف کھجوا (ضلع سارن) کے کتب خانہ سے ڈھونڈ نکالا ہے، اس پر استاذی المکرم جناب حافظ شمس الدین صاحب (شعبۂ فارسی، پٹنہ کالج) نے ایک سیر حاصل مقالہ لکھکر معاصر (۳۹ء) پٹنہ میں شائع کیا تھا، راقم الحروف کی نظر سے بھی یہ دیوان گذرا ہے، خیال تھا کہ جناب حافظ صاحب موصوف اس دیوان کو طبع کراکے دلدادگانِ علم و ادب کو ممنون فرمائینگے مگر ابھی تک یہ زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا، اس میں سے بعض چیزیں ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں،

ایک حمد ملاحظہ ہو:۔

اے حسن تو دیباچہ مجموعۂ معنی | لامع شدہ از روے تو انوار تجلی

حاشا کہ جدا از تو تواں زیست ولیکن | دارم بخیال سے ز جمال تو تسلی

در مملکت حسن توئی شاہ ولایت | کردم بولاے تو کنوں روے تولی

تا حسن تو در جلوہ گری گشت ازاں رو | وامق پے عذرا شد و مجنوں پے لیلی

حقانیت سے لبریز بہت سی رباعیاں ہیں، مثلاً

اے وادی لامکاں مکانت | دور ازل و ابد زمانت

اے ہستی بے نشان مطلق — شد ہستی بے نشاں نشانت
اے آنکہ مقید زمان و زمنی — کس را نبود لائق ذاتت سخنی
جائے کہ بنی حق ثنای تو بگفت — کے شرح صفات تو کند ہمچو منی

اے خالق جملہ خلائق — تو مصدر کل و خلق مطلق
حالتے روی نمود از لاریب — کاندر آں نہ شہادتست نہ غیب

صوفیانہ رنگ کی بھی رباعیاں ہیں مثلاً

اے آنکہ در دخول بر خود بستی — با تو بہ و زہد عافیت بنشستی
ہرگز نکند فائدہ ایں طور ترا — از خود چو گذشتی بخدا پیوستی

مایم صفات حی مختار و دود — ظاہر شدہ از آئینۂ نور شہود
چوں یک شجریم در باغ وجود — ما فرع وجودیم و خدا اصل وجود

حمد و نعت سے ملے جلے مطالب کی بھی رباعی ملاحظہ ہو:-

من ہیچ نیم ہیچ نمیدارم نام — بر فضل تو با نیم شب و روز دوام
آنگاہ بحق حرمت مہتر لام — بر بندہ ہمایوں برساں فیض تمام

کچھ خالص نعتیہ رباعیاں بھی ہیں، مثلاً

اے سرور کائنات در اصل وجود — حقا کہ توئی حبیب حی معبود
برخیز تماجمال عالم آرا — زیرا کہ توئی ز خلق عالم مقصود

سلطان سریر انبیائی تو — خورشید سپہر اولیائی تو
مردم ہمہ پیرو طریق تو اند — رہ شرع بخلق رہ نمائی تو

پند و موعظت پر بھی رباعیاں ہیں، مثلاً

اے آنکہ طلبگار رہ حقیقی — در شیوۂ صدق و راستی صدیقی
زنہار کہ غیر حق نہ بینی ہرگز — چوں بینی تو کافر و زندیقی

خواہی کہ جہاں بطبع تو راست شود — آں چیز کہ خواستی ہماں خواست شود
باید کہ تو با طبع جہاں راست شوی — تا ہر چہ خدا خواستہ آں خواستہ شود

ہمایوں کی مزید ایک دو غزلوں کی سادگی اور خیالات کی برجستگی سے بھی ناظرین محظوظ ہوں،

حجابیست از نور در پیش ما — ازاں گشتہ بیگانہ ایں خویش ما
ترشاہی و حسن و صد سلطنت — بلائیست برجان درویش ما
ملاحت نمودی زجاں سوختی — نمک ریختی تازہ بر ریش ما
وفا می کنی و جفا می کشیم — نباشد جز ایں شیوۂ کیش ما
ہمایوں بروے تو چوں بنگرد — حجابست از نور در پیش ما

سراسر شادی عالم بیکدم غم نمی ارزد — بنزد م عمر صد سالہ بیک ماتم نمی ارزد
غنیمت داں جوانی را کہ ایام خوشست اما — ولے با عالم پیری و پشت خم نمی ارزد
کو آں تخت سلیمان و کو آں احوال مو انش — چہل خانہ زرقاروں بیک جو ہم نمی ارزد
بنودی جنت الماوی بنودی ایں ہمایوں را — کہ جنت ... بسر گر دانی آدم نمی ارزد

دربار کے شعراء۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہمایوں کے دامن دولت سے بہت سے شعراء منسلک تھے، ہم ان میں سے بعض ارباب کمال کا اجمالی ذکر کرتے ہیں،

جنوبی۔ مولانا جنوبی بدخشاں کے بہت ہی ممتاز اور بلند پایہ شاعر تھے، ہمایوں نے جب شہزادگی کے زمانہ میں اس جگہ کو تسخیر کیا، تو وہ ہمایوں سے وابستہ ہو گئے، بدخشاں کی

فتح پر ہمایوں کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا جس میں ذوالفقار شروانی اور سلمان ساؤجی کے قصائد کی طرح بہت سی صنعتوں کو ملحوظ رکھا، اس قصیدہ کی تشبیب یہ تھی :-

شہنشاہا رخ تو لالہ و نسریں لب تو جاں — ہمی بینم لب تو غنچۂ رنگیں شدہ خنداں
نمی گویم خط تو سبزہ و ریحاں خد تو گل — شود ظاہر قد تو فتنۂ دوراں دم جولاں

ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ صنعت توشیح سے مصرعوں کے مجموعے سے یہ مطلع ہو جاتا ہے،

شہنشاہ دیں پادشاہ زماں — زبخت ہمایوں شدہ کامراں

اور اگر ہر مصرع کے خط کشیدہ الفاظ کو ترتیب دیا جائے تو یہ مطلع ہو جائے گا۔

رخ تو لالہ و نسریں خط تو سبزہ و ریحاں — لب تو غنچۂ رنگیں قد تو فتنۂ دوراں

اور اگر صنعت عکس کے ساتھ یہ شعر پڑھا جائے تو مطلع کی تشکیل اس طرح ہو جائے گی،

خط تو سبزہ و ریحاں رخ تو لالہ و نسریں — قد تو فتنۂ دوراں لب تو غنچۂ رنگیں

اسی طرح قصیدہ میں معما، اظہار مضمر اور تاریخ گوئی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

نادری۔ مولانا نادری سمرقند سے آگرہ آئے، ہمایوں کی قدردانی سے ان کی غربت امارت میں بدل گئی، ملا عبدالقادر بدایونی کے قول کے مطابق وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر بلکہ جید علماء کامل فضلاء اور نوادر روزگار میں سے تھے، نظمیں، رباعیاں، اور قصائد کہنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے، ہمایوں کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے جس میں اس کی شریعت نوازی، علم پروری اور ریاضی دانی کی داد دی ہے، اس کے کچھ اشعار یہ ہیں :-

المنۃ للہ کہ بجمعیت خاطر — باعیش نشستند حریفان معاشر
خاقان معظم شہ جم قدر ہمایوں — کش ہست قوی دست و دل از قدرت قادر

از دانش او دانش اصحاب بصیرت — واز بینش او بینش ارباب بصائر

منہی چو حرام است در احکام شریعت — اقبال نماید بمراعات اوامر

ہر نکتۂ حکمت کہ لب لعل تو فرمود — مشہور جہاں شد چو حدیث متواتر

مبنی است کہ شرح کتب فن ریاضی است — تصنیف متین تو از ایجاز دوایر

احصاے کمالات تو کردن نتوانم — کا ندر ہمہ فنہا شدہ کامل و ماہر

مولانا نادری کا انتقال ۹۶۶ھ میں ہوا، میر امانی کابلی نے اس مصرع سے تاریخ وفات نکالی

گفتا خرد کہ رفت یکے از سخن وراں[1]

فارغی۔ مولانا شیخ ابو البرابر فارغی بن شیخ وجیہ الدین ہرات کے رہنے والے تھے، شیخ زین الدین کے رشتہ دار تھے، دونوں ساتھ سنہ ۹۳۲ھ آکر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے، جہاں وہ بابر اور ہمایوں کے جود و کرم سے سیراب ہوئے۔ شیخ زین الدین کا ذکر بابر کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ شیخ فارغی بہت ہی خوش طبع، شیریں زبان اور بذلہ سنج تھے، ہمایوں اور بیرم خان خانخاناں کی شاہانہ اور فیاضانہ توجہ سے آسودہ زندگی بسر کرنے کے لائق ہو گئے تھے، مگر درویشانہ صفت کے حامل تھے، اس لیے شعر و شاعری میں وہی رنگ جھلکتا ہے،

رشتۂ جمعیت اے یاران بہم مگسلید — در پریشانی پریشا نیست از ہم مگسلید

چو تیر خود کشی از سینہ ام بگذار پیکاں را — مرا دل دہ کہ تا مردانہ در راہت دہم جاں را

سنہ ۹۴۰ھ میں بمقام آگرہ انتقال ہوا، اور شیخ زین الدین وفائی کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے،

---

[1] منتخب التواریخ ج ا ص ۴۸۵، [2] ایضاً ص ۴۸۶، [3] صبح گلشن ص ۳۰۶، ۳۰۵،

طاہر دکنی۔ شاہ طاہر خواندی دکنی عراق کے رہنے والے تھے، اپنے کو شاہ طہماسپ کا عزیز کہتے تھے، ہندوستان آکر ہمایوں کے دربار سے وابستہ ہوئے، علم نجوم کے بھی ماہر تھے، چنانچہ ہمایوں کے فلکیاتی ذوق کے مطابق انوری کے تتبع میں ایک قصیدہ کہا ہے، جس کے دو شعر یہ ہیں:-

حمل چہر چو آید بہ شبستان حمل — لالہ فانوس برافروزد و نرگس مشعل

کوہ از در دسر بہمن و دی آکنوں — شوید از ناصیہ اش ابر بہاری صندل

شاہ طاہر اہل بیت سے تعلق رکھتے تھے، ہمایوں کے دربار کے علماء سے مناظرہ میں کچھ تلخی پیدا ہوگئی تو اپنے چھوٹے بھائی شاہ جعفر کے پاس دکن چلے گئے، جہاں برہان نظام شاہ اول والیٔ احمد نگر نے ان کی بڑی پذیرائی کی، اور جملۃ الملک کے عہدہ پر مقرر کیا، برہان نظام شاہ نے شاہ طاہر سے متاثر ہو کر ان ہی کا مذہب اختیار کر لیا، شاہ طاہر کا شمار دکن کے برگزیدہ بزرگوں میں کیا جاتا ہے، ۹۵۲ھ میں ان کا انتقال ہوا، تاریخ وفات "و تابع اہل بیت بودہ" سے نکلتی ہے، فن شعر و شاعری میں ان کا کمال بدرجۂ اتم تک پہنچ گیا تھا، منقبت، قصائد، اور مثنوی کہنے میں اپنی شاعری کا جوہر دکھاتے تھے۔[۱]

ایوب۔ خواجہ ایوب ماوراء النہر سے ہندوستان آیا، باپ کا نام خواجہ ابوالبرکات فراقی تھا، جو فضیلت اور علمی پایہ کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، وہ سلمان ساوجی کی تقلید میں قصائد کہتے تھے، بابر کے زمانہ میں ہندوستان آئے، اور اس کے خوان کرم سے متمتع رہے، ہمایوں نے بھی ان کی قدر دانی کی اور ان کے لڑکے خواجہ ایوب کو ندیم خاص بنایا، خواجہ ایوب میں فن شاعری کے تمام کمالات موجود تھے، مگر وہ اوصاف حمیدہ کا

---

[۱] منتخب التواریخ ج ۱ ص ۴۸۳،

حاصل نہ تھا، ہمایوں نے اس کی طبیعت کی کجروی کے سدباب کے لیے شاہی بیگمات میں سے ایک کو اس کے حبالۂ عقد میں بھی دیا، مگر طبیعت اصلاح کی طرف مائل نہ ہوئی، ہمایوں نے بالآخر حج کعبہ کے لیے روانہ کیا، مگر اس سعادت سے بھی وہ محروم رہا، اور راستہ سے لوٹ کر سلطان بہادر گجراتی کا وظیفہ خوار ہوگیا، جس نے اس کی مزاج داری بھی کی، شاعری میں تخلص کبھی ایوب اور کبھی فراقی کرتا تھا، ایک غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں،

اے شاخ گل کہ ہمچو سہی قد کشیدۂ	برگرد لب خطی ز زمرد کشیدۂ
قدت برآمدہ چو الف مد نظرہ	وز ابرواں فراز الف مد کشیدۂ
بر حرف دیگراں زدۂ قرعۂ قبول	بر حرف عاشقاں قلم رد کشیدۂ
تشویش میکشی مکش اے نقشبند چین	ناید چو چشم و زلفش اگر صد کشیدۂ
از دولت وصال فراقی طمع مبر	جور و جفائے یار چو بے حد کشیدۂ

کاہی۔ قاسم کاہی عرف میاں کالے، کابل سے ہمایوں کے عہد میں ہندوستان آیا، مختلف علوم و فنون مثلاً تفسیر، کلام، تصوف، ہیئت، موسیقی اور شاعری میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا، ہمایوں کی نظر میں بڑی محبوبیت حاصل کی تھی، چنانچہ اس نے ہمایوں کی شان میں بہت سے قصائد اور قطعات کہے ہیں، ایک قصیدہ میں ہمایوں کے ذوق ہیئت کی بھی ترجمانی کی ہے، فن شاعری میں معما اور تاریخ گوئی میں بڑی مہارت حاصل کی تھی، وہ اپنے عہد کے شعراء میں اسلیے ممتاز تھا کہ اس کی شاعری میں سادگی کے ساتھ بڑی موسیقی تھی، ہمایوں کی وفات شیر شاہی قلعہ کے اندر زینے سے گر کر ہوئی تو اس نے یہ قطعہ کہکر تاریخ نکالی،

ہمایوں بادشاہ آں آفتابی	کہ فیض شامل او عام افتاد
بنائے دولتش چوں یافت رفعت	اساس عمرش از انجام افتاد

چو خورشید جہانتاب از بلندی — بیاباں در نماز شام افتاد

جہاں تاریک شد در چشم مردم — خلل در کار خاص و عام افتاد

پے تاریخ او کاہی رقم زد — ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

یہ قطعہ بہت مقبول ہوا، اکبری دور میں کاہی فتنۂ دین الٰہی سے ملوث ہو گیا تھا، اس لیے ملا عبدالقادر بدایونی اس کے مذہبی عقائد کو مطلق پسند نہ کرتے تھے، اور اپنی منتخب التواریخ (جلد سوم ص ۱۷۵) میں اس کے لیے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں، پھر بھی وہ معترف ہیں کہ شعر و سخن کی وادی میں اس کا کوئی شریک نہ تھا، وہ رقمطراز ہیں، کہ اس کی دو غزلیں اہل سلوک، اور بزم ملوک میں بڑی مقبول تھیں، ان دونوں غزلوں کا مطلع یہ ہے:-

مرغ تا بر فرق مجنون پر زدن انگیز کرد — آتش سودائے لیلیٰ بر سر او تیز کرد

چوں ز عکس عارضش آئینہ پر گل شود — گرد راں آئینہ طوطی بنگرد بلبل شود

اس کا دیوان عام طور سے پسند کیا جاتا تھا، بوستاں کے جواب میں ایک مثنوی گل افشاں بھی لکھی ہے[۱]

امان اللہ۔ شیخ امان اللہ پانی پتی عالم بھی تھے، صوفی بھی اور شاعر بھی، ہمایوں کے دربار کے ممتاز شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا، تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا،[۲]

جلالی۔ مولانا جلالی ہندی، فارسی اور ہندی دونوں میں اشعار کہتے تھے،[۳]

میر ویسی۔ ہمایوں کے درباری امراء میں سے تھا، سخن سنج بھی تھا، اور شعراء کا سرپرست بھی، اس کے دولتکدہ پر شعر و سخن کی مجلسیں برابر منعقد ہوتی تھیں،[۴]

حیدر۔ حیدر تونیائی شعر و شاعری کے علاوہ نغمہ و موسیقی کے لیے بھی مشہور تھا،[۵]

---

[۱] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۱۷۵، [۲] ایضاً، [۳] ایضاً، [۴] ایضاً، [۵] منتخب التواریخ جلد اول ص ۴۰۰۔

ضمیری۔ مولانا ضمیری بلگرامی بھی دربار کے ممتاز شاعر تھے، مثنوی اور قصائد لکھنے میں بڑی شہرت حاصل کی تھی،

موجی۔ قاسم خاں بدخشی المتخلص بہ موجی ہمایوں کے امرا میں سے تھا، یوسف زلیخا کے تتبع میں ایک مثنوی لکھی جس میں چھ ہزار اشعار تھے۔[1]

فضلا، ہمایوں کے دربار کے فضلا، کی تعداد بھی شعرا سے کم نہیں، وہ ان سے برابر اختلاط رکھتا تھا، طبقات اکبری میں ہے:-

درصحبت آں مقتدائے جہاں ہمہ وقت فضلا، و علماء و اکابر بودند وہمہ از اول شب تا بصبح بصحبت می گذشت، و نہایت آداب درمجلس آنحضرت مرعی می بود، ہمہ وقت بحث علمی مذکور مجلس بہشت آئیں می گشت، ارباب فضل وہنر در عہدش رونق تمام پیدا آمد (ج ۲ ص ۰۵ ۱۰۲)

ہم اختصار کے ساتھ ان ارباب علم کا ذکر کرکے ان کی یاد کو تازہ کرتے ہیں، اس صف میں سب سے پہلے غیاث الدین محمد المعروف بہ **خواند امیر** پر نظر پڑتی ہے، یہ روضۃ الصفا کے مصنف میر خواند کا نواسہ تھا، باپ خواجہ ہمام الدین محمد بدخشاں کے والی سلطان محمود کا وزیر تھا، خواند امیر ہرات میں پیدا ہوا، جو اس وقت علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا، اسی مدینۃ العلم میں خواند امیر نے ہوش سنبھالا، ہرات کے سلطان غازی حسین بن منصور کا دربار شعرا اور علما کا مرجع تھا، اس کے وزیر میر علی شیر کی علم نوازی اور معارف پروری سے یہ دربار اور بھی جگمگا اٹھا تھا، خواند امیر کی علمی صلاحیت و لیاقت کی شہرت سنکر میر علی شیر نے اس کو دربار کے زمرۂ فضلا، میں شریک ہونے کی دعوت دی، جس کو اس نے قبول کیا، یہاں رہ کر اس نے فن تاریخ نویسی کا گہرا مطالعہ کیا، اور اپنے علمی مشاغل بھی جاری رکھے، میر علی شیر کی علمی صحبتوں میں اس کی ذہنی جلا اچھی طرح ہوئی، اور اس شہر یار علم

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳۲۵،

کی ہمت افزائی سے اس نے اپنی پہلی کتاب مآثر الملوک لکھی، جس میں ملوک و اولیاء کے اقوال،
پند و نصائح کے علاوہ خلفائے بنی امیہ و بنو عباس کے ساتھ ساتھ طاہریوں، سامانیوں اور غزنویوں
کی تاریخ بھی ہے، میر علی شیر کے نام سے اس نے اپنی ایک دوسری کتاب خلاصۃ الاخبار فی
بیان احوال الاخیار معنون کی جو روضۃ الصفا کی تلخیص ہے، میر علی شیر کی سوانح حیات بھی مکارم
الاخلاق کے نام سے لکھی، سلطان حسین کے ایک دوسرے وزیر خواجہ کمال الدین محمود کے نام سے
دستور الوزراء معنون کی، اس میں آغاز اسلام سے لیکر ۹۱۰ھ تک کے ممتاز وزراء اور سلاطین کے
حالات ہیں، یہ کتاب ۹۱۵ھ میں تیار ہوئی، اسی زمانہ میں خواند امیر نے اخبار الاخیار، جواہر الاخبار
اور غرائب الاسرار قلمبند کیں، جن میں شاید صوفیانہ مسائل پر مباحث اور اولیاء عظام کے کوائف
ہیں، روضۃ الصفا کی تکمیل کے لیے خواند امیر نے اس کی ساتویں جلد ۹۲۹ھ میں ختم کی، جس کی اہمیت
آج بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہے، اسی سال اس نے فن انشاء پر نامۂ نامی تحریر کی، سیاسی انقلابات
سے ہرات جب ایران کے حکمراں شاہ اسمٰعیل کے زیر نگیں ہوگیا، تو خواند امیر اس علم دوست
بادشاہ کے متوسلین میں سے ہوگیا، خواند امیر اس بادشاہ کے الطاف و اکرام کا معترف ہے،
وہ کچھ دنوں جورجان اور غیرجستان کے والی مرزا محمد زمان کی فیاضیوں اور زرپاشیوں سے بھی
سیراب ہوتا رہا، شاہ اسمٰعیل صفوی کے وزیر کریم الدین حبیب اللہ کی سرپرستی میں اس نے حبیب السیر فی
اخبار افراد البشر تین جلدوں میں ترتیب دی جو ابتدائے عالم سے ۹۳۰ھ تک کے تاریخی واقعات پر
مشتمل ہے، اور اب تک اہم تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے، اس کتاب کے ختم ہونے سے پہلے
حبیب اللہ کا انتقال ہوگیا، جس کے بعد خواند امیر کے دن اچھے نہیں رہے، اسی لیے ۹۳۳ھ میں
وہ ہرات سے قندھار چلا آیا، قندھار سے آگرہ ۹۳۵ھ میں بابر کے پاس پہنچا، بابر اس کی علمی شہرت
سے واقف ہوچکا تھا، اس لیے بڑی گرمجوشی اور عقیدت سے اس کا استقبال کیا، اور اپنا ندیم خاص

بنایا، وہ بنگال کی مہم پر گیا، تو خواند امیر بھی اس کی معیت میں تھا، بابر کی وفات کے بعد ہمایوں نے بھی اس سے وہی عقیدت قائم رکھی، اور اس سے عزت و احترام سے پیش آتا تھا، تاریخ عالم پر جو اس کو قدرت حاصل تھی، اس سے متاثر ہو کر ہمایوں نے اس کو امیر مورخ کا خطاب دیا، خواند امیر کو بھی ہمایوں سے گہرا لگاؤ اور اخلاص پیدا ہو گیا تھا، جس کا اظہار اس نے مختلف قصائد قطعات اور مثنوی میں بھی کیا ہے، ان قصائد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، ہمایوں کی فرمایش پر اس نے **قانون ہمایونی** لکھی جس میں ہمایوں کے مبدعات اور "اختراعات" کا ذکر کیا ہے، یہ کتاب ہمایوں کے دور کے تمدن اور مصنوعات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بہت مفید سمجھی جاتی ہے، اس کے کچھ حصے ابو الفضل نے اپنی تاریخ اکبر نامہ میں بھی نقل کئے ہیں، (دیکھو جلد اول ص ۶۰ - ۳۵۹) یہ کتاب بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہو گئی ہے، شروع میں جناب محمد ہدایت حسین صاحب کا پر از معلومات مقدمہ ہے،

خواند امیر ۹۴۱ھ میں ہمایوں کے ساتھ بہادر شاہ والی گجرات کے خلاف مہم میں بھی شریک ہوا، وہاں کی آب و ہوا اس کو موافق نہیں آئی، علیل ہو کر دہلی واپس آیا تو ۹۴۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور خواجہ شیخ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں سپرد خاک کیا گیا، اس کے ایک لڑکے سید عبد اللہ خاں کی تربیت اکبر نے کی، اور اس کی شاہانہ نوازشوں سے وہ منصب ہفت صدی سے بھی سرفراز ہوا،

یوسف بن محمد ہروی ہرات سے آکر اکبر کے دربار سے منسلک ہوا، طبیب بھی تھا اور شاعر بھی، ایک قصیدہ بعنوان قصیدہ فی حفظ صحت لکھ کر بابر کی علالت کے زمانہ میں ۹۳۷ھ میں پیش کیا، بابر کی وفات کے بعد ہمایوں نے اس کی سرپرستی کی، چنانچہ یوسف نے طب میں ایک کتاب ریاض الادویہ ۹۴۶ھ میں ہمایوں کے لیے تحریر کی، فن طب میں یوسف کی تین اور تالیفات

ہیں جن کے نام جامع الفوائد اور فوائد الاخیار ہیں، فن انشا پر ایک تصنیف بدایع الانشا بھی اسی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے[۱]

محمد بن اشرف الحسینی الرستمداری بابر اور ہمایوں دونوں کے ساتھ وابستہ رہا، بابر کو ہندوستان کی تسخیر کے سلسلے میں جتنے جواہرات ملے ان کے اقسام پر محمد نے ایک کتاب جواہر نامۂ ہمایونی لکھی، اس میں جواہرات سے متعلق مفید معلومات اور مباحث ہیں[۲]

ہمایوں کے عہد میں، اور شاید اسی علم دوست بادشاہ کے لیے مولانا محمد بن علی بن محمد المسکن القاضی السمرقندی نے ایک ضخیم کتاب جواہر العلوم ہمایونی لکھی، یہ مختلف علوم و فنون کی قاموس ہے، جو ایک ہزار چھ سو اٹھائیس صفحے پر مشتمل ہے[۳]

جوہر۔ ہمایوں کا آفتابچی تھا، خلوت اور جلوت میں برابر بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا، کچھ دنوں کے لیے ہیبت پور کا محاصل اور پھر سرکار پنجاب و ملتان کا خزانچی بھی مقرر ہوا، ہمایوں کی وفات کے بعد ۹۹۵ھ میں **تذکرۃ الواقعات** لکھنی شروع کی، جس میں ہمایونی عہد کے سیاسی واقعات ہیں، یہ کتاب تصنع اور تکلف سے پاک ہے، اس لیے ایک مفید تاریخی لٹریچر سمجھا جاتا ہے، میجر چارلس اسٹوارٹ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے،

ہمایوں کے ایک دوسرے ہم جلیس **بایزید** نے ۹۹۹ھ میں اکبر کی فرمایش سے **تاریخ ہمایوں** لکھی، جس میں سیاسی حالات کے علاوہ ہمایوں کے عہد کے فضلاء و شعراء کا بھی ذکر ہے، میری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری، (دیکھو مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری ۹۵ جلد اول)

---

[۱] برٹش میوزیم مخطوطات فارسی ص ۵، ۲ و ۵۲۹، [۲] ایضاً ص ۹۶ و ۹۵، [۳] اس کتاب کے کچھ اقتباسات کے لیے مغل دربار میں فارسی ادب از عبد الغنی دیکھو،

ہمایوں اور علم ہیئت | ہمایوں علم ہیئت و نجوم سے خاص شغف رکھتا تھا، اور اس فن میں بہت اچھی

استعداد بہم پہنچائی تھی، بدایونی لکھتا ہے،

"در علوم نجوم و ہیئت و سائر علوم غریبہ بے نظیر"[1]

اکبر نامہ میں ہے:-

"توجہ اقدس باصطرلاب و کرہ و سائر آلات رصدی درجۂ کمال داشت"[2]

طبقات اکبری جلد دوم (ص ۱۰۴) کا مصنف رقمطراز ہے:

"و در علم نجوم و ریاضی بے بدل بود"

ہمایوں نے ہیئت کا فن علامہ الیاس اردبیلی سے سیکھا تھا، جو ہیئت کے تمام فنون اور رصد بندی میں ماہر تھے، وہ ہمایوں کو اس قدر عزیز تھے کہ ان سے کسی حال میں جدا ہونا گوارا نہ کرتا تھا، چنانچہ جب تخت و تاج کھو کر ہندوستان سے دور عراق و ایران میں غریب الوطن پھر رہا تھا تو اس مصیبت اور پریشان حالی میں بھی علامۂ موصوف سے ہیئت و نجوم کا درس لیتا تھا، اس سفر میں شیخ ابوالقاسم جرجانی بھی ساتھ تھے، یہ دونوں عالم ہمایوں کو قطب شیرازی کی کتاب درۃ التاج کا سبق دینے میں مشغول رہتے، اکبر نامہ میں ہے:-

"و از ہمیں حدود مولانا نورالدین محمد ترخاں۔ بجہت طلب شیخ ابوالقاسم جرجانی و مولانا الیاس اردبیلی کہ بفضائل صوری و کمالات معنوی آراستگی داشتند، فرستادند و در کابل آمدہ بشرف ملازمت مشرف شدند و از آمدن ایں دو عزیز بسیار منبسط و منشرح گشتند و مذاکرہ کتاب درۃ التاج درمیان آوردند"[3]

آوارۂ غربت ہونے کے باوجود اس فن سے ہمایوں کی دلچسپی برابر قائم رہی، اور جب کبھی وہ

---

[1] منتخب التواریخ بدایونی ج ا ص ۴۶۷، [2] اکبر نامہ ص ۲۲۰۔ [3] اکبر نامہ ص ۲۲۱،

کسی نئے شہر میں داخل ہوتا تھا، ہیئت اور نجوم کے آلات تلاش کرتا تھا، اکبر نامہ میں ایک دلچسپ لطیفہ لکھا ہے، کہ جب وہ تبریز پہنچا تو اپنے ملازم بیگ محمد آختہ بیگی کو کہا کہ یہاں کوئی کرہ تلاش کرو، فارسی میں کرہ گھوڑے کے بچھڑے کو کہتے ہیں، خوش فہم نوکر نے آقا کے اس حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ چند بچھڑے لے کر خدمت شاہی میں حاضر ہوا، بادشاہ اس غول بیابانی کو دیکھ کر ہنس پڑا،[1]

ہمایوں کی مہارت فن کی ایک دلیل یہ بھی ہے، کہ وہ علماء کی طرح ہیئت و ریاضی کا درس دیتا تھا، نورالدین ترخاں نوری سفیدونی نے جو ریاضی، نجوم اور حکمت کے ممتاز عالم تھے، ہمایوں ہی سے درس حاصل کیا تھا، مآثر الامراء میں مولانا مذکور کے حال میں ہے،

مولانا بفضل و کمال و شجاعت و سخاوت و انصاف داشت و بہ ہیئت و ہندسہ و اصطرلاب شوق مند بود .... و صحبتش باجنت آشیانی (ہمایوں) کوک گشتہ، واز جملہ ندیمان و مجلس نشینان بزم ہمایونی گردید .... گاہے بادشاہ از و استفادۂ علوم می کرد، و گاہے او از علم ریاضی خصوص اصطرلاب از جناب ہمایونی کہ دریں فن مہارت تمام داشت استفاضہ می نمود،[2]

ہمایوں نہ صرف خود ان علوم میں مہارت حاصل کرتا رہا، بلکہ ملک کے نجومیوں کی واقفیت میں بھی اضافہ کرنے کی کوشش میں لگا رہا، اس نے کئی جگہ رصد خانے بنانے کا ارادہ کیا اور بہت سے آلات رصد ترتیب دیئے،[3] سلطان سلیمان خان کے ترکی امیر البحر کو جو علم ہیئت کا بہت بڑا عالم تھا، کئی مہینے اپنے دربار میں روک رکھا تاکہ وہ چاند اور سورج کے گرہنوں کا حساب تیار کرے، اور ہندوستان کے نجومیوں کو آفتاب کی گردش اور خط استواء کے نکات پڑھنے میں مدد دے، ترکی امیر البحر کئی مہینے کام میں مصروف رہا اور نجومی مشاہدات ختم کیے،[4]

---

[1] اکبر نامہ ص ۲۲۲ [2] مآثر الامراء ج ۱ ص ۷۴ [3] اکبر نامہ ص ۳۶۸ [4] ترجمہ مرآۃ الممالک پروفیسر ڈینیسن راس باب ہشتم، بحوالہ معارف ج ۲۲ ص ۵۸

ہمایوں کو اس فن میں اس قدر انہماک تھا کہ اس نے اپنی عزیز جان تک اسی فن کی خدمت میں گنوا دی، پرانی دہلی میں قلعہ کے اندر شیر شاہ نے شیر منڈل کے نام سے ایک بہت بلند بہ منزلہ عمارت بنوائی تھی، ہمایوں نے اس عمارت کی برجی کو بلندی کے سبب سے رصد خانہ بنا دیا تھا، ایک شام کو ستارۂ زہرہ کے طلوع ہونے کا گمان کیا جا رہا تھا، بادشاہ ریاضی دانوں کی ایک جماعت کے ساتھ اسی برجی میں بیٹھ کر مباحث میں مصروف تھا، اور زہرہ کے طلوع ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ مغرب کی اذان ہوئی، بادشاہ اذان سنکر اٹھنا چاہتا تھا کہ زینہ سے پھسل کر گرا، اور سخت زخمی ہوا، اور پھر اس زخم سے جانبر نہ ہو سکا،[۱]

بادشاہ کو چرخیات و فلکیات سے جو انس تھا اس کے اثر سے ملک میں بھی علم ہیئت کا ذوق پیدا ہوا اور ملک میں عام طور پر آلات فلکی بننے لگے،

کرے اور اصطرلاب، جو عموماً مدارس میں آج نظر آتے ہیں، ان کا ابتدائی رواج دینے والا ہمایوں ہی تھا، اس نے خود ایک خاص قسم کا اصطرلاب ایجاد کیا تھا، جو "اصطرلاب ہمایونی" کے نام سے مشہور ہے، چنانچہ اس کے عہد کے اکثر اصطرلاب اور کرات، اب تک مختلف مقامات میں محفوظ ہیں،[۲]

ہمایوں کا سپہ سالار بیرم خان خانخاناں فارسی و ترکی کا ایک اچھا شاعر اور صاحب دیوان تھا،[۳] اس نے ہمایوں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا، اس میں اصطرلاب سے تشبیب کی ہے، جو ہمایوں کے فلکیاتی ذوق کا بین ثبوت ہے، کہتا ہے:-

آں چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار   آں مدر گز میانہ شہابش کند گزار

---

[۱] اکبر نامہ ص ۳۶۳، [۲] دیکھو مضمون "لاہور کا ایک فلکی آلات ساز" از مولانا سید سلیمان ندوی، معارف جلد ۳۲ نمبر ۲ ص ۸۸، [۳] بیرم خاں نے نظری سمرقندی سے شاہنامہ کے طرز پر ایک مثنوی شاہنامہ ہمایونی لکھانے کی کوشش کی مگر وہ مکمل نہ ہو سکی،

باآنکہ می کشد بہ وخور برابری | آمد بجاں ز حلقہ بگوشانِ شہریار
تا در بچشم کو کبۂ آفتاب را | چوں ہمچۂ لوائے شہنشاہ نامدار
پیوستہ آسمان و زمیں زیرِ حکم او ست | ہمچو نگین خاتم شاہِ جسم اقتدار
برکف نہادہ خوانِ زری پر ز اشرفی | تا بر قدوم اشرف شاہاں کند نثار
شاہ بلند قدر ہمایوںؔ کہ از شرف | بر درگہش سپہر نہد روے افتقار[1]

ہمایوںؔ کے تمام خانگی، ملکی اور سیاسی کاموں میں ہیئت اور نجوم کے اصول کا لحاظ رکھا جاتا تھا، ہمایوںؔ نامہ میں گلبدنؔ بیگم لکھتی ہے کہ جب ہمایوںؔ کی شادی حمیدہ بانو سے قرار پائی تو ہمایوںؔ نے خود اصطرلاب اٹھاکر ستاروں کی گروش معلوم کرکے تاریخ مقرر کی،[2] اکبر جب امرکوٹ کے صحرا میں پیدا ہوا تو ہمایوںؔ نے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ماہتاب برج اسد میں ثابت ہے، اس نے اسی وقت پیشنگوئی کی کہ اکبر صاحب اقبال اور درازعمر ہوگا،[3] جو مستقبل میں حقیقت ثابت ہوئی،

ہمایوںؔ اپنے فلکیاتی ذوق کے سبب سعد اور نحس کا اس قدر قائل تھا کہ وہ ملک کے تمام کاموں کو اسی اصول کے ذریعہ سے انجام دینے کی کوشش کرتا تھا جس زمانہ میں کابلؔ کا انتظام اس کے سپرد تھا، اس نے ایک روز ان تین آدمیوں کے نام فال لیے جو ایک مقررہ دن اس کو راہ میں ملے، ان تین آدمیوں کے نام مراد خواجہ، سعادت خواجہ اور دولت خواجہ تھے، ہمایوںؔ نے اپنی سلطنت کی اساس انہی ناموں پر رکھی، ممالک محروسہ اور ملازموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا، دولت، سعادت، مراد، کل سپاہیوں کا نام اہل دولت رکھا، کیونکہ انہی کی مساعدت پر دولت واقبال کا انحصار ہے، حکما، وعلما، مشائخ اور شعراء کو اہل سعادت کہا، کیونکہ ان کے

---

[1] بدایونی ج ۳ ص ۱۹۱، [2] ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم ص ۵۲ [3] ایضاً ص ۵۸

ذریعہ سے سعادت ابدی حاصل ہوتی ہے، بقیہ لوگوں کو اہل مراد سے موسوم کیا،
اسی فلکیاتی اصول پر ہفتہ کے دنوں کو بھی ان جماعتوں سے منسوب کیا، روز شنبہ و پنجشنبہ کو اہل سعادت سے متعلق کیا، ان دونوں دنوں میں وہ علم و عبادت کے ناظموں کے ساتھ وقت گذاتا تھا، اہل سعادت کے ساتھ ان دنوں کے مخصوص کرنے کی یہ وجہ تھی کہ شنبہ زحل کے ساتھ منسوب ہے، اور زحل مشائخ کا قدیم مربی سمجھا جاتا ہے، پنجشنبہ مشتری سے متعلق ہے، وہ علما، کا ستارہ ہے، یکشنبہ و سہ شنبہ اہل دولت سے متعلق تھے، ان میں امور سلطنت انجام پاتے تھے، یہ دن اس لیے مقرر کیے گئے تھے کہ یکشنبہ آفتاب سے متعلق ہے، اس کی تربیت کے پرتو سے سلطنت و فرمانروائی ہوتی ہے، سہ شنبہ متعلق ہے مریخ سے اور مریخ سپاہی کا مربی ہے، ہمایوں نے جمعہ کا مبارک دن اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا، بقیہ دو دن اہل مراد کے لیے وقف تھے۔
ہمایوں نے دو خرگاہ بنائے تھے، جن کی ساخت خالص ہیئت کے اصول پر تھی، ایک خرگاہ کو آسمان کے برجوں کی طرح بارہ حصوں میں تقسیم کیا تھا، اور ہر برج میں ایک پنجرہ آویزاں تھا، جس کے سوراخوں سے "کواکب دولت" کے انوار چمکتے تھے، دوسرا خرگاہ یونانی ہیئت کے نو دن آسمانوں کی پوری نقل تھی، ہر آسمان میں جو ستارے ہیں ان کے نمونے اس میں بنے تھے،
ہمایوں کی سب سے دلچسپ نجومی اختراع بساط نشاط تھی، اس بساط میں فلکی دوائر و کرات عناصر بنائے تھے، پہلا دائرہ جو فلک اطلس سے منسوب تھا سفید تھا، دوسرا کبود، تیسرا زحل کی مناسبت سے سیاہ، چوتھا مشتری کے لحاظ سے صندلی، پانچواں مریخ کے تعلق سے سرخ، چھٹا نیر اعظم یعنی آفتاب کی مناسبت سے زریں، ساتواں زہرہ کے سبب سے سبز، آٹھواں عطارد کے لحاظ سے سوسنی، نواں ماہتاب کے تعلق سے سفید، ماہتاب کے دائرہ کے بعد آگ اور ہوا کے کرے بالترتیب

بنے ہوئے تھے، اس کے بعد کرۂ خاک و آب تھا، کرۂ خاک میں ساتوں اقلیموں کے نقشے بنے ہوئے تھے، ہر دائرہ مختلف قسم کی جماعت کے لیے مخصوص تھا، مثلاً امرائے ہندی کو دائرہ زحل میں اور سادات و علماء کو دائرۂ مشتری میں بیٹھنے کا حکم تھا، ہمایوں نے اپنی ذات کے لیے دائرۂ زریں اختیار کیا تھا، اسی طرح نجوم کے قاعدہ سے ہر روز کے ستارہ کا جو رنگ ہوتا اس دن وہی رنگ پورے دربار کا ہوتا تھا، مثلاً یکشنبہ کو آفتاب کے رنگ کے لحاظ سے زرد لباس اور دوشنبہ کو ماہتاب کے رنگ کی مناسبت سے سبز لباس پہنا جاتا۔[۱]

ہمایوں اور علم ریاضی | نجوم و ہیئت کے لیے علم ریاضی ایک لازمی چیز ہے، اس لیے ہمایوں اس علم میں بھی بڑی اچھی استعداد رکھتا تھا، اس کے عہد کے تمام ممتاز ریاضی دان اس کے حضور میں حاضر رہتے، اکبرنامہ میں ہے:-

"در اقسام خاصہ ریاضی در زمان خود نظیر و سہیم نہ داشتند"۔

ایک دوسری جگہ ہے:-

"در اقسام علوم ریاضی آنحضرت را پایہ بلند بود و ہموارہ با ارباب حکمت صحبت می داشتند و ممتازان علم ریاضی در پایۂ سریر والا کامیاب سعادت بودند"۔[۲]

فرشتہ لکھتا ہے:-

"در علم ریاضی علم مہارت می افراشت، مدار صحبتش با علما و فضلا بودہ، ہمہ وقت در مجلس او مسائل علمی مذکور می شد"۔[۳]

ہمایوں اور کتبخانہ کا ذوق | ظاہر ہے کہ ہمایوں نے اپنے علمی ذوق کے سبب کتابوں کا ذخیرہ جمع

---

[۱] ان تفصیلات کیلئے دیکھو قانون ہمایونی (بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، اورینٹ جلد پنجم ص ۱۲۰، ۱۱۶)

[۲] اکبرنامہ ص ۳۶۸، [۳] فرشتہ جلد اول مقالہ دوم ص ۲۴۳

کیا ہوگا، چنانچہ جب وہ ہندوستان کے تخت و تاج کا از سر نو مالک ہوا، اور اس کو کچھ اطمینان نصیب ہوا تو دہلی کے شیر شاہی قلعہ میں شیر منڈل کے نام سے جو سہ منزلہ عمارت بنی ہوئی تھی اس کی تیسری منزل پر اس نے اپنا کتب خانہ قائم کیا، یہ اپنی بلندی کے سبب سے کسی قدر رصد خانہ کا کام بھی دیتی تھی، یہاں بیٹھکر اہل علم سے اکثر علمی مباحثہ کرتا تھا، شاہی کتبخانہ کا مہتمم نظام المعروف بہ بازبہادر تھا،[1]

کتابوں سے ہمایوں کا شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ میدان جنگ میں بھی ایک چھوٹا سا کتبخانہ اپنے ساتھ رکھتا، چنانچہ جب وہ کھمبایت کا محاصرہ کر رہا تھا تو اس کے ساتھ منجملہ اور کتابوں کے تاریخ تیمور کا وہ نسخہ بھی تھا جس کو بہزاد نے اپنے کمال فن سے مصور کیا تھا، اس محاصرہ میں ایک جنگلی قبیلہ نے شاہی خیمہ پر شبخوں مارا تو لوٹ کے مال میں یہ نادر نسخہ بھی جاتا رہا، لیکن پھر فوراً ہی واپس مل گیا۔[2]

جب ہمایوں بے تخت و تاج عراق، ایران اور افغانستان میں پھر رہا تھا تو اس وقت بھی چیدہ چیدہ کتابیں اس کے ساتھ تھیں۔ اور اس کے کتب خانہ کا مہتمم اس کے ہم رکاب تھا،[3]

ہمایوں اور تعلیمی ادارے | ہمایوں کا زمانہ حکومت زیادہ تر طوائف الملوکی اور پریشان حالی میں گذرا، اس لیے اس کو عام طور پر تعلیمی مدارس اور ادارے قائم کرنے کا موقع نہیں ملا، پھر بھی دہلی میں اس نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس کے ایک مدرس شیخ حسین تھے،[4] پھر اسی عہد میں شیخ زین الدین خوافی جو نظم و نثر کے بہت بڑے عالم تھے، آگرہ میں اپنا ذاتی مدرسہ قائم کیا،[5]

---

[1] تزک جہانگیری، [2] اکبرنامہ ج ۱ ص ۱۴۶، [3] اکبرنامہ دفتر اول، [4] آئین اکبری، [5] منتخب التواریخ بدایونی ص ۱۷۱،

اکبر

ہمایوں کی زندگی جس طرح آوارہ گردی اور پریشان حالی میں گذری وہ سب کو معلوم ہے، شہزادہ اکبر کو چند سال بھی اپنے بزرگ باپ کے ساتھ چین سے رہنا نصیب نہیں ہوا، اور اکثر ظالم چچا کے پنجہ میں گرفتار رہا، اور ابھی تیرہ ہی برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اور سلطنت کا بار عظیم اس کے کندھوں پر رکھ دیا گیا، اس حالت میں اس کی تعلیم کہاں تک ہو سکتی، تاہم ہمایوں کی علم دوستی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے لڑکے کی تعلیم سے غافل نہ رہے، چنانچہ ان ہنگامہ پرور واقعات کے ہوتے ہوئے بھی وہ اکبر کی تعلیم کی سخت نگرانی رکھتا تھا، وہ جب ۴ سال ۴ مہینے اور ۴ روز کا ہوا، تو اس نے مکتب کی رسم ادا کی،

ابو الفضل رسم مکتب کی تقریب کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے:-

"در ہفتم شوال ایں سال کہ از عمر ابد پیوند، حضرت شاہنشاہی چہار سال و چہار ماہ و چہار روز شدہ بود، بآئین رسم و عادت آن آموختۂ درسگاہ الٰہی و رموز دان بستان ربانی را در مکتب بشری در آوردند و ملا زادہ ملا عصام الدین ابراہیم را باین خدمت گرامی شرف اختصاص بخشیدند، اگرچہ در نظر ظاہر بینان بآموزش فرستادند، اما در دیدہ دور بینان بارگاہ ظہور آن حضرت را بپایۂ والائے آموزگاری بردند، از غرائب آنکہ حضرت جہانبانی کہ از علوم آسمانی آگاہ بودند، و بدقائق نجوم می رسیدند، باتفاق ستارہ شماران باریک بین

واسطرلاب دانانِ وقت شناس ساعتے خاص برائے افتتاح تعلیم آن حضرت تعین فرمودہ بودند کہ دہاو دار و اعمار بہم نتواند رسید، چون ساعت مختار رسید آن موہب بآداب الٰہی بہ لباس بازی درآمدہ در پردہ احتجاب مختفی شدند، و بآن ہمہ توجہ و اہتمام بادشاہی ہرچند تگاپوے فرمودند پے بآن حضرت نبردند، و آگاہ دلان روشن ضمیر ازین سر بدیع دریافتند کہ مقصود ازین آنست کہ آن خداوند خرد والا کہ مخصوص بہ تعلیم ایزدی ست بعلوم رسمی روزگار مشوب و منسوب نشود تا در ہنگام ظہور این خدیو نکتہ شناس بہ زمانیان ظاہر شود کہ دانشوری این پادشاہ دانشوران از قسم موہبتے ست، نہ از جنس مکتسبی و باوجود این معنی بہ ضمیر اقدس آنحضرت نقوش حرفی و علوم رسمی چہ از انچہ رقم زدہ قلم اہل فنون شدہ و چہ ازان نکات اسرار کہ از مبدء فیاض بے توسط تعلیم و تعلم بر باطن انور رفائزہ گشتہ جادہ ظہور دارد، و لہٰذا ارباب حکمت و اصحاب ریاضت و صاحبان علوم ظاہری و وارثانِ صنائع کلی و جزوی چون در بساط حضور اقدس میرسند، از شناسائی خود سر خجالت بہ گریبان تامل فرو بردہ، حیران می مانند، القصہ چون چندگاہ بیش آن افادات انتساب بخواندنی زیادہ تر از ناخواندن اشتغال داشتند اہل ظاہر بہ عدم کوشش آخون حمل کردہ در تغیر آن اہتمام نمودند، و آن بیچارہ را معزول ساختہ خدمت اور البمولانا بایزید مقرر ساختند و ندانستند کہ کارفرمایان ابداع اہتمام دارند کہ ضمیر الہام آن نور پرور ایزدی محل انعکاس نقوش مداوی و مورد انطباع سواد علوم ظاہری نگردد،"[1]

ملا عصام الدین ابراہیم اور مولانا بایزید کے علاوہ اکبر کے استادوں میں مولانا پیر محمد خان

[1] اکبرنامہ ج ا ص ۲۷۱ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، یہ طویل اقتباس اس لیے بھی درج کیا گیا ہے کہ اکبرنامہ کے طرز انشاء کا نمونہ پیش نظر رہے۔ آگے چل کر اس کتاب کی خصوصیات کا ذکر آئے گا۔

نقیب خاں، مولانا عبد القادر، بیرم خان، اور مولانا میر عبد اللطیف قزوینی کے نام بھی لیے جاتے ہیں، میر عبد اللطیف قزوینی اکبر کو دیوان حافظ پڑھایا کرتے تھے،[1]

اب سوال یہ ہے کہ ہمایوں کی کوشش اور ان مختلف استادوں کی تعلیم کہاں تک بار آور ہوئی، اکبر کے خوشامدی مورخین تو اس کو امی محض بتاتے ہیں، چنانچہ ابھی آپ دیکھ چکے کہ ابو الفضل اسکو امی بتاکر اس کی تشریح یوں کرتا ہے کہ پروردگار کو ثابت کرنا تھا کہ یہ برگزیدۂ الٰہی علوم ظاہری کی تحصیل کے بغیر ہمارے نامتناہی فیوض کا منبع ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ اس میں حکمتِ الٰہی یہ تھی کہ اہل عالم پر یہ روشن ہو جائے کہ اکبر کی تمام عقل و دانش خداداد یعنی الہامی ہے، کسی بندہ سے حاصل کی ہوئی نہیں، ابو الفضل کی یہ ساری توجیہ ظاہراً اس لیے ہے کہ وہ اکبر کو پیغمبروں کی صف میں لاکر کھڑا کرنا چاہتا ہے،

لیکن اس کو کون مان سکتا ہے، کہ ہمایوں کی اتنی توجہ اور استادوں کی اتنی کوشش کے باوجود اکبر لکھنا پڑھنا کچھ جانتا ہی نہ تھا، حالانکہ اس کے لیے یکے بعد دیگرے کئی استاد مقرر ہوئے، جہاں ایک استاد کی غفلت معلوم ہوئی، وہ فوراً علیحدہ کر دیا گیا، اور دوسرا مقرر ہوا، اس کے باوجود وہ نوشت و خواند سے اتنا نابلد رہا، کہ اپنا نام تک بھی اپنے ہاتھ سے لکھ نہیں سکتا تھا، ابو الفضل آئین اکبری میں "آئین آموزش" کے عنوان سے یہ لکھتا ہے کہ "گیتی خداوند" کے کہنے سے "حرف آموزی و تعلیم" کا ایک طریقہ نکالا گیا ہے جس سے بچے برسوں کی تعلیم مہینوں میں حاصل کر لیتے ہیں، جو شخص "آئین آموزش" کے اتنے دقیق نکتہ کو اس آسانی سے حل کر لیتا ہے، اس کے متعلق یہ کیونکر کوئی مان سکتا ہے کہ وہ حرف شناسی سے محروم تھا،[2]

---

[1] منتخب التواریخ، بدایونی، ج ۳، ص ۹۸، [2] رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ظفر نامہ کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہے، اسکے سرورق پر اکبر کے دست خاص کا لکھا ہوا لفظ "فروردین" موجود ہے، اس کے نیچے جہانگیر کے قلم کی لکھی ہوئی یہ تصدیق ہے کہ یہ لفظ عرش آشیانی کا لکھا ہوا ہے، اور پھر اس کے نیچے شاہجہان کی تحریر ہے۔ (جامعہ بابت ماہ جنوری ۲۹ء)

بہرحال اکبر کے امی محض ہونے کا دعویٰ شک و شبہ سے خالی نہیں، لیکن یہ بات تعریف کے قابل ہے کہ اس کم سوادی اور علمی کم مائیگی کے باوجود اس کے دل میں علوم و فنون کا شوق اور ان کی قدر دانی کا وہ جوش تھا کہ جو کسی عالم بادشاہ کو بھی نہیں ہوا۔ اس کے ذاتی شوق کا یہ عالم تھا کہ فارسی کی مشہور کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اس کے سامنے پڑھی نہ گئی ہو۔ اخلاق ناصری، کیمیائے سعادت، قابوس نامہ، مکتوبات شرف منیری، گلستاں، حدیقہ، مثنوی معنوی، جام جم، بوستاں، شاہنامہ، مثنویات شیخ نظامی خمسہ، امیر خسرو و مولانا جامی کے کلیات، خاقانی اور انوری کے دیوان، اور ہر قوم کی تاریخیں اس کے سامنے باقاعدہ پڑھی جاتی تھیں۔ پڑھنے والے ہر روز جہاں ختم کرتے تھے، وہاں اکبر اپنے ہاتھ سے نشان (شاید صفحہ یا تاریخ کا) بنا دیتا تھا۔ اور جب کتاب ختم ہو جاتی، تو پڑھنے والے کو جیب خاص سے انعام دیتا۔ اسی [illegible] کا نتیجہ تھا کہ کوئی تاریخی سرگذشت یا فقہی مسئلہ یا علم و فن اور فلسفہ و حکمت کا نکتہ ایسا نہ تھا جو اس کے علم میں نہ ہو، اور جس پر وہ خود بحث اور گفتگو نہ کر سکتا ہو۔ دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم کے بہت سے اشعار اس کو یاد تھے۔[1] اس کے علمی مذاق کے متعلق جہانگیر تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:۔

[illegible] (ص [illegible])

اکبر کا علمی ذوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ خود شعر بھی کہنے لگا تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے:

[illegible] گلشن [illegible] بغایت موافق [illegible] دقائق تخیلات شعری نکتہ سنجی و موشگافی می فرمایند۔[2]

تاریخ فرشتہ میں ہے

اگرچہ خط و سواد [illegible] شعر گفتے و در علم تاریخ وقوفے تمام داشت

---

[1] [illegible] [2] ایضاً، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔

وقت ص ہندیکہ می دانست ہ[۵]

ابوالفضل نے اکبر کے اشعار میں حسب ذیل بیت کو خاص طور سے پسند کیا ہے ۔

نیست زنجیر جنون در گردن مجنون را   عشق دست دوستی در گردنش افگندہ است

ریاض الشعرا، (مؤلفہ علی قلی والہ داغستانی) میں بھی اکبر کے کچھ اشعار منقول ہیں، عبد اللہ خاں اوزبک والیٔ توران کو ایک موقع پر اس نے حسب ذیل مستزاد رباعی لکھ بھیجی :-

عمرم ہمہ در فراق و ہجران بگذشت   با درد و الم
این عمر گرانمایہ چہ ارزان بگذشت   در رنج و ستم
عمر یکہ بشد صرف سمرقند و ہری   با عیش و طرب
افسوس کہ در آگرہ ویران بگذشت   با غصہ و غم

اکبر کی ایک منظوم خط و کتابت کی بھی مثال ملاحظہ ہو، علی قلی خان جس کو خان زمان کا خطاب ملا تھا، ہمایوں کے ممتاز امراء میں سے تھا، جونپور کا حاکم بنا کر بھیجا گیا، اکبر کے عہد میں اس نے علم بغاوت بلند کیا، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اکبر خود مہم میں شریک ہوا، خان زماں علم پرور ہونے کے علاوہ خود بھی شاعر تھا، سلطان تخلص کرتا تھا (مآثر الامرا ج ۱ ص ۶۳۰) اس نے سخت لب و لہجہ میں اکبر کے پاس یہ اشعار لکھ بھیجے ،

اے سد سکندر زمانہ در تو   یاجوج یود سپاہی لشکر تو
در دور تو آثار قیامت پیداست   دجال توئی خواجہ امینا خر تو

اکبر نے اپنے حریف کو اسی انداز اور درشتی سے یہ جواب دیا

اے خان زمان کہ پر بود لشکر تو   شد دولت من باعث کر و فر تو

---

[۵] تاریخ فرشتہ

کمتر باشم ز خبرِ دجال امروز — فردا من اگر چہ را نسازم سرِ تو

خان زماں نے پھر لکھ بھیجا،

تا ہست اثر خالصہ در کشورِ تو — مشکل کہ بمن جنگ کند لشکرِ تو

بگذر ز زر و سیم کہ تا نوکرِ تو — از سر گذرد برائے سیم و زرِ تو

اکبر کا جواب تھا:۔

باآنکہ بود خاک درم افسرِ تو — امروز بمن فرد نیاید سرِ تو

از دولت من ہست ترا سیم و زری — وز زورِ زر است قدرتِ لشکرِ تو

خان زماں شاہی فوج کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکا، بالآخر اس نے سپر ڈال دی، اور معذرت پیش کی،

اے شاہ زمان منم کمین نوکرِ تو — وز ترس نمی توانم آمد برِ تو

از دور تو قصد کشتن من داری — نزدیک چساں توانم آمد برِ تو

اکبر نے خان زماں کو معاف کر دیا، اور لکھا،

گفتی تو چو راستی خدایا ورِ تو — صد رحمتِ حق بہ پدر و مادرِ تو

تغییر مدہ تو سکہ و خطبۂ من — تا من نکنم آرزوے کشورِ تو[1]

تذکرۂ روزِ روشن میں اکبر کا ذکر شعراء کے زمرہ میں لیا گیا ہے، اور اس میں اس کے حسب ذیل اشعار منقول ہیں[2]

شبنم مگو کہ بر ورقِ گل فتادہ است — کان قطرہ ہا ز دیدۂ بلبل فتادہ است

گریہ کردم ز غمت موجبِ خوشحالی شد — ریختم خونِ دل از دیدہ و دلم خالی شد

[1] ریاض الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔ [2] تذکرہ روزِ روشن مؤلفہ نواب صدیق حسن ص ۶۱۲،

قطعہ

دوشینہ بکوے می فروشان — پیمانۂ مے بزر خریدم
اکنون ز خمار سر گرانم — زر دادم و درد سر خریدم

رُباعی

از بار گنہ خمیدہ پشتم چکنم — نے راہ بمسجد نہ کنشتم چکنم
نے وصف کافر نہ مسلمان جایم — نے لائق دوزخ نہ بہشتم چکنم

ایضاً

من یاد دلم کہ خون شد از دوری او — من یار غمم ز دست مہجوری او
در آئینہ چرخ نہ قوس قزح است — عکسی است نمایان شد از جوری او

محمد حسین آزاد دربار اکبری میں مذکورۂ بالا اشعار میں سے دو شعر، قطعہ اور دوسری رباعی کے علاوہ حسب ذیل دو شعر اور نقل کرتے ہیں:

من بنگ[1] نمی خورم مے آرید — من چنگ نمی زنم نے آرید
حاجی بسوئے کعبہ رود از برائے حج — یارب بود کہ کعبہ بیاید بسوے ما

ان اشعار کو نقل کرتے ہوئے محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ

"اشعار جو اس کے (یعنی اکبر کے) نام پر کتابوں میں لکھے ہیں، اسی کے ہیں، کیونکہ اگر وہ ملک شاعری میں شہرت چاہتا تو شاعر ہزاروں تھے، جلدیں کی جلدیں تیار کر دیتے، لیکن جب یہی چند شعر اس کے نام پر لکھے ہیں، تو اپنی ہی طبیعت کی امنگ ہے، جو کبھی کبھی موقع پر ٹپک پڑی ہے، شاید لفظ یا لفظوں میں کسی نے اصلاح بھی کر دی ہو۔"[2]

---

[1] ایک جگہ من بنگ کے بجائے من قہوہ بھی ہے۔ [2] دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص ۱۲۱

اکبر نے بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں بھی کیں، اور نقادان فن نے اس کی تنقید کی داد بھی دی،[1] ایک بار محفل نغمہ و سرود میں اس کے سامنے فغانی کا یہ شعر پڑھا گیا

مسیحا یار و خضر ش ہم رکاب و ہم عنان عیسے　　فغانی آفتاب من بدین اعزاز می آید

اکبر نے دوسرے مصرعہ میں برجستہ اصلاح دی،

فغانی شہسوار من بدین اعزاز می آید

ایک موقع پر ملا طالب صفاہانی کی حسب ذیل رباعی پڑھی گئی جس میں حکیم ابوالفتح گیلانی کی موت پر افسوس، اور اس کے بھائی حکیم ہمام کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا،

مہر دو برادرم کہ دمساز آمد　　او شد بہ سفر دین ز سفر باز آمد

او رفت بدنبالہ او عمر برفت　　دین آمد و عمر رفتہ ام باز آمد

اکبر نے اس رباعی کو سنا تو کہا کہ دنبالہ کے لفظ سے شعر میں گرانی پیدا ہوگئی ہے، اس لیے یہ مصرعہ اس طرح پڑھا جائے تو بہتر ہے،

او رفت و ز رفتنش مرا عمر برفت

اکبر کو علم و فن سے جو خاص طبعی مناسبت تھی، اس کا اندازہ ان صحبتوں سے بھی ہوتا ہے، جو اس کے دربار کا ایک ضروری جزو تھیں، اور جس میں ہر فن کے ارباب کمال جمع ہو کر مختلف مسائل پر بحث و [illegible] کرتے تھے، اور ان میں اکبر خود برابر کا حصہ لیتا تھا، خوش قسمتی سے اس کے دربار میں ایسے ارباب کمال جمع ہو گئے تھے جو کسی ایک عہد میں کم نظر آتے ہیں، عام طور پر لوگ اکبری عہد کی عظمت صرف سیاسی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دور علمی حیثیت سے بھی کم درخشاں نہیں، یوں تو ہندوستان کی مغل حکومت کی تاریخ میں علم پروری اور علم نوازی اس حکومت کی بنیاد کے ساتھ ہی نظر آتی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ علوم و فنون کا عظیم الشان قصر اس کم سواد

[1] شعر العجم جلد ۳ ص ۱۶

فرمانروا کے عہد میں تکمیل کو پہنچا، آیندہ سطروں میں ہم ان تراجم اور تالیفات کا ذکر کرتے ہیں جو اکبر کی سرپرستی میں ظہور میں آئیں، اور جس کی وجہ سے اس کا عہد سلطنت علمی حیثیت سے جگمگا اٹھا تھا

تراجم

مہابھارت، سنہ ۹۹۰ھ میں اکبر کی خواہش ہوئی کہ مہابھارت کا فارسی ترجمہ ہو، اس کام کے لیے پہلے ہندو پنڈتوں کو جمع کیا، جنھوں نے مہابھارت کے نفس موضوع کی تشریح کی، اس کے بعد ترجمہ کا کام نقیب خان کے سپرد کیا، اور اکبر نے خود کئی متواتر راتوں میں نقیب خان کو ترجمہ کی نوعیت کو سمجھایا، ملا عبدالقادر بدایونی بھی جو زبان سنسکرت کے ایک جید عالم تھے، اس کام پر مامور ہوئے، ملا عبدالقادر مہابھارت کو "مزخرفات لاطائل" بتاتے ہیں، اس لیے بطیب خاطر اس کام کو انجام دینا نہیں چاہتے تھے، لیکن شاہی حکم کی نافرمانی بھی نہیں کر سکتے تھے، چار مہینوں کی کوششوں کے بعد ۸ اباب (ہژدہ فن) کا ترجمہ کر سکے، بقیہ حصوں کو ملا شیری، نقیب خان اور حاجی سلطان تھانیسری[۱] نے ختم کیا، شیخ فیضی نے ترجمہ کی زبان کو سلیس اور فصیح بنانے کی کوشش کی، لیکن وہ دو باب سے آگے نہ بڑھ سکا، حاجی سلطان تھانیسری نے اپنے ترجمہ پر نظر ثانی کرنا شروع کیا، اس کام میں مشغول ہی تھا کہ سیاسی اسباب کی بنا پر اس کو دار السلطنت چھوڑنا، اور بھکر جانا پڑا، ملا عبدالقادر بداونی کا بیان ہے کہ حاجی سلطان تھانیسری جب یہ ترجمہ کر رہا تھا تو کسی نے پوچھا کہ کیا لکھ رہے ہو تو جواب دیا کہ "حرف دہ ہزار سالہ را بزبان حال موافق می سازم" یعنی ہزاروں سال کی پرانی بات کو آج کی بات بنا رہا ہوں، (جلد سوم ص ۱۱۹) ملا شیری مہابھارت کے بارہ میں کہتے تھے کہ یہ افسانہ ایک خواب ہے جو کسی نے بخار کی حالت میں دیکھا تھا، (بدایونی ج ۳ ص ۲۲۹) اکبر نے مہابھارت کے ترجمہ کا نام **رزم نامہ** رکھا، اور تمام معرکوں کی تصویریں بنا کر اس میں شامل

[۱] ملا بدایونی حاجی سلطان تھانیسری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "علوم نقلیہ را خوب ورزیدہ"، آخر وقت میں وہ تھانیسر اور کرنال کا کروڑی مقرر ہوا تھا۔

کیں، ابوالفضل نے اس پر دو جزو کا خطبہ لکھا ہے[۱] جس کے آخر میں ۹۹۳ھ درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب پانچ سال کی مدت میں ترجمہ ہوئی، یہ ترجمہ اب تک متفرق کتبخانوں میں پایا جاتا ہے،[۲]

۲۔ **رامائن**۔ ۹۹۵ھ میں عبد القادر بدایونی نے شاہی حکم کے بموجب رامائن کا ترجمہ کرنا شروع کیا، اور ۹۹۹ھ میں تمام کیا، ترجمہ ایک سو بیس جزء پر مشتمل تھا، کتاب کے تتمہ پر مندرجۂ ذیل شعر لکھکر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا،

ماقصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند ۔۔۔ جان سوختہ کردیم بہ جانانکہ رساند

اکبر بہت محظوظ ہوا، اور اس نے خواہش ظاہر کی کہ ملا بدایونی اس کتاب کے آغاز میں کوئی فاضلانہ مقدمہ بھی تحریر کردیں، لیکن ملا صاحب نے کفر والحاد کی کتاب پر کچھ لکھنے سے اغماض کیا،[۳] اس کتاب کے نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ (انڈیا آفس لائبریری نمبر ۱۹۶۳، بوڈلین لائبریری نمبر ۱۳۱۵)

۳۔ **سنگھاسن بتیسی**۔ ۹۸۲ھ (۵-۷۵-۵۷۴ء) میں ملا عبد القادر بدایونی نے سنسکرت کی مشہور کتاب سنھاسند وترنیستی کا فارسی ترجمہ کیا، اس کتاب میں ہندوؤں کے مشہور راجہ بکرماجیت (مالوہ) کے متعلق بتیس قصے ہیں، اکبر کا حکم پاکر بدایونی نے ایک برہمن کی مدد سے ان قصوں کو فارسی جامہ پہنانا شروع کیا، اور اختتام پر کتاب کا تاریخی نام خرد افزا رکھا، اکبر اس کتاب کو بہت پسند کرتا تھا،[۴] (بوڈلین لائبریری، کتاب نمبر ۱۳۲۴)

۴۔ **حیوۃ الحیوان**۔ دمیری کی شہرۂ آفاق کتاب حیوۃ الحیوان کو شیخ مبارک نے فارسی

---

[۱] بدایونی جلد دوم ص ۳۲۱ - ۳۱۹ [۲] فہرست مخطوطات انڈیا آفس و برٹش میوزیم کتب نمبر ۴ - ۵۶۳۸، بوڈلین لائبریری کتب نمبر ۱۴-۱۳۰۶، [۳] بدایونی ج ۲ ص ۳۶۶ [۴] ایضاً ص ۱۸۴،

میں ترجمہ کیا، اکبر کو نقیب خان پڑھ کر سناتا، اور معنی سمجھاتا جاتا تھا، اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے اکبر نے اس کے فارسی ترجمہ کا حکم دیا، جو شیخ مبارک کے ذریعہ سے سنہ ۹۸۲ھ میں تمام ہوا،[۵۱]

۵۔ **اتھربن**۔ اکبر ہندوؤں کے علوم و فنون سے خاص شغف رکھتا تھا، چنانچہ ان کے مذہب کے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ان کی مقدس کتابوں کو زبان فارسی میں لانا چاہتا تھا، اتھربن کا فارسی ترجمہ اسی خیال سے اس نے کرایا، اول اول یہ کام ملا عبد القادر بدایونی کے ذمہ کیا گیا، ایک نومسلم برہمن بھاون ان کو مطلب سمجھاتا جاتا تھا، اور وہ فارسی میں لکھتے جاتے تھے، لیکن اس کی عبارت بہت ہی مغلق تھی، اس لیے وہ یہ کام انجام دینے سے قاصر رہے، چنانچہ فیضی سے فرمایش کی گئی پھر شیخ ابراہیم سرہندی کے ذمہ یہ خدمت سپرد ہوئی، گو شیخ ابراہیم نے یہ خدمت انجام دی، مگر ترجمہ اکبر کے خاطر خواہ نہیں ہوا،[۵۲]

۶۔ **انجیل**۔ نصرانی مبلغین کو شاہی دربار میں، کافی رسوخ حاصل ہو گیا تھا، اکبر نے ان سے دین مسیحی کی جزئیات اور تفصیلات سے واقفیت حاصل کی، اور شہزادہ مراد کو اس کی تعلیم بھی دلائی، اسی سلسلہ میں انجیل کے فارسی ترجمہ کی بھی فرمایش کی، اس کام کے لیے ابو الفضل کو مامور کیا، جس نے سنہ ۹۸۶ھ میں اس کو انجام دیا،[۵۳] انہی اسباب پر بعض خوش فہم پادریوں کا خیال ہے کہ اکبر نے دین مسیحی قبول کر لیا تھا،

۷۔ **تزک بابری**۔ بابر نے اپنے خیالات اور واقعات ترکی میں قلمبند کیے تھے، اور تزک بابری نام رکھا تھا، اکبر کی فرمایش سے خان خانان عبد الرحیم نے اس کا فارسی ترجمہ سنہ ۹۹۸ھ میں کیا، جس کی زبان نہایت سادہ، شستہ اور صاف ہے،

۸۔ **لیلاوتی**۔ فن ریاضی کی ایک مشہور کتاب ہے، اس کا ترجمہ فیضی نے کیا،

---

۵۱ بدایونی جلد دوم ص ۳۴۲، ۵۲ ایضاً ص ۲۱۲، ۵۳ ایضاً ص ۲۶۰

۹۔ **تاجک**۔ علوم نجوم میں ایک معتبر تصنیف ہے، تکمل خان گجراتی نے اس کو فارسی کا قالب پہنایا،

۱۰۔ **ہربنس**۔ کرشن جی کی زندگی کے حالات ہیں، مولانا شیری نے اس کا فارسی ترجمہ کیا،

۱۱۔ **معجم البلدان**۔ شہاب الدین عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ حموی رومی بغدادی (متوفی ۶۲۶ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب معجم البلدان کا فارسی ترجمہ ملا احمد ٹھٹھ، قاسم بیگ، شیخ منور اور دوسرے فضلائے روزگار نے مل کر کیا،

۱۲۔ **تاریخ کشمیر**۔ راج ترنگنی مصنفہ کلہانا، سلطان زین العابدین والی کشمیر کے زمانہ میں بزبان سنسکرت لکھی گئی،، اکبر نے کشمیر کے سفر میں اس کتاب کو دیکھا، اس کی خواہش ہوئی کہ اس کا فارسی ترجمہ ہو، چنانچہ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے اس کام کو انجام دیا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس میں کشمیر کے متعلق چار ہزار برس کا حال لکھا ہے[۱]، اس کتاب کا فارسی ترجمہ چھپ گیا ہے[۲]، اس ترجمہ کا انتخاب ملا عبد القادر بدایونی نے بھی سلیس زبان میں کیا، جو شاہی کتبخانہ میں داخل ہوا،[۳]

۱۳۔ **کلیلہ دمنہ**۔ قصہ کے طور پر حکمت عملی کی ایک مشہور سنسکرت کتاب ہے، ملا حسین واعظ نے اس کا فارسی ترجمہ کیا تھا، لیکن سخت الفاظ و استعارات سے یہ ترجمہ اس قدر پیچیدہ اور مشکل ہو گیا تھا، کہ اس کا سمجھنا آسان نہ تھا، اکبر نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت کو سامنے رکھکر ایسی عبارت میں ترجمہ کیا جائے کہ اس کے پند و نصائح آسانی سے سمجھ میں آئیں، ۹۹۶ھ میں ابوالفضل نے اس کام کو انجام دیا، کتاب کا نام عیار دانش رکھا گیا[۴]۔ کتاب کے اختتام پر ابوالفضل نے ایک خاتمہ لکھا ہے، جس میں بعض نادر معانی اور نکات بیان کئے گئے ہیں، (انڈیا آفس لائبریری، کتب نمبر ۷۷۰ - ۷۷۶، بوڈلین لائبریری نمبر ۴۴۴ - ۴۴۰)

---

[۱] آئین اکبری ص ۷۶، [۲] انڈیا آفس کیٹلاگ ص ۲۰۱، [۳] بدایونی جلد دوم ص ۳۷۴، [۴] آئین اکبری ص ۷۷،

۱۴- **نل دمن**- یہ عشق و محبت کا ایک جگر گداز قصہ ہے ۱۰۰۳ھ میں ملک الشعرا فیضی نے خسرو کی لیلی مجنوں کی بحر میں اس کو نظم کیا، اس میں چار ہزار دو سو اشعار ہیں، اور قابل تعجب یہ امر ہے کہ صرف پانچ مہینے کی مدت میں یہ عظیم الشان کارنامہ انجام پذیر ہوا، اس کے کمال و خوبی کی داد ملا عبدالقادر جو فیضی کو ہمیشہ سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اس طرح دیتے ہیں:

"والحق مثنوی ست کہ دریں سی صد سال مثل آن بعد از میر خسرو شاید در ہند کسی دیگر نہ گفتہ باشد"[۱]

۱۵- **جامع رشیدی**۔ ۹۹۳ھ میں عبدالقادر بدایونی نے عربی کی ضخیم کتاب جامع رشیدی کا فارسی ترجمہ کیا، جو خزانہ عامرہ میں داخل ہوا،[۲]

۱۶- **بحر الاسمار**۔ ہندی افسانہ کی ایک کتاب تھی، سلطان زین العابدین نے اس کا تھوڑا سا ترجمہ کرایا تھا، نامکمل تھی، ابوالفضل کی فرمایش سے ملا عبدالقادر نے اس کام کو اپنے ذمے لیا، چنانچہ ۵ مہینے میں ترجمہ کا کام ختم کیا، جو ساٹھ جزمیں تھا، اکبر نے خوش ہو کر دس ہزار ٹنکہ اور ایک گھوڑا انعام میں دیا،[۳]

۱۷- اکبر نے شہرزوری کی عربی تالیف تاریخ الحکما کا بھی فارسی ترجمہ مقصود علی تبریزی سے شہزادہ سلیم کی تعلیم کے لیے کرایا، اس کا نام نزہتہ الارواح و نزہتہ الافراح رکھا گیا،

اکبر نے نہ صرف سنسکرت کی کتابیں فارسی میں منتقل کرائیں بلکہ عربی و فارسی کی کتابوں کو سنسکرت کا قالب پہنایا، چنانچہ **زیچ مرزائی** کا ترجمہ سنسکرت میں ہوا، اس کے ترجمے میں میر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، کشن جوتشی، گنگا دھر، مہیش مہانند شریک تھے۔[۴]

تصنیفات | **تاریخ الفی** اکبر چاہتا تھا کہ اسلامی عہد کے ابتدائی دور سے اس کے زمانہ تک کی

---

۱ بدایونی ج ۲ ص ۳۹۶ ۲ ایضاً ص ۳۰۲،۳۰۱ ۳ عبدالقادر بدایونی ج ۲ ص ۴۰۱ ۴ آئین اکبری، ص ۷۶،

کوئی مفصل اور مکمل تاریخ ہو، اس کی خواہش کے مطابق نقیب خان، شاہ فتح اللہ، حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی، نظام الدین احمد، عبدالقادر بدایونی، مولانا احمد ٹھٹھوی، جعفر بیگ اور آصف خان نے ملکر اس کام کو انجام دیا۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ختم ہوئی، ملا عبدالقادر بدایونی تین جلدوں کا تذکرہ کرتے ہیں، مگر انڈیا آفس لائبریری میں اس کی چار جلدیں موجود ہیں[1]، تیسری جلد میں ۹۹۷ھ تک کی تاریخ ہے، اور ۱۰۰۰ھ میں ختم کی گئی، پروفیسر ڈاؤسن کا خیال ہے کہ ان چاروں جلدوں کے علاوہ دو اور جلدیں ہونی چاہئیں[2]، اس کتاب کی تدوین اور ترتیب میں مختلف اہل علم نے حصہ لیا، اس کا ذکر ملا عبدالقادر بدایونی اس طرح کرتے ہیں :-

اسی سال یہ حکم ہوا کہ ہجرت سے چونکہ ہزار سال پورے ہو گئے، اور لوگ ہر جگہ ہجری تاریخ لکھتے ہیں، اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی تاریخ مرتب کی جائے جو ان تمام سلاطین کے حالات پر حاوی ہو، جو ابتداء سے ابتک اسلام میں گذرے ہیں، جس کے دوسرے معنے یہ تھے کہ ایسی تاریخ لکھوائی جائے جو دوسری تمام تاریخوں کی ناسخ ہو، اس تاریخ کا بادشاہ نے الفی نام رکھا اور یہ بھی حکم دیا کہ سنین کے ذکر میں ہجرت کے بجائے رحلت لکھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روز وفات سے آج تک کے واقعات کے لکھنے کے لیے سات آدمیوں کو حکم ہوا، پہلے سال کے واقعات کو نقیب خان لکھیں، اور دوسرے کو شاہ فتح اللہ، اور تیسرے کو حکیم ہمام، چوتھے کو حکیم علی، پانچویں کو حاجی ابراہیم سرہندی، چھٹے کو مرزا نظام الدین احمد۔ اور ساتویں کو فقیر قلمبند کرے، اسی طرح ۳۵ سال کی تاریخ مرتب ہو گئی، ایک رات کو ساتویں سال کے متعلق جب کہ فقیر خلیفہ ثانی کے حالات لکھ رہا تھا اور قصر الامارۃ کی بناء و انہدام

[1] انڈیا آفس کیٹلاگ ص ۰۴۔ [2] الیٹ ج ۵ ص ۱۵۰،

ام کلثوم بنت امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہما کے نکاح کے معاملہ، اور پانچوں وقت کی نماز کی تعیین، اور شہر نصیبین کی فتح، اور بڑے بڑے مرغ کے مانند بچھوؤں کے معاملے تک پہنچا تو سخت مباحثہ ہوا، مرزا جعفر آصف خان ثالث کی بری طرح دُگت ہوئی، برخلاف شیخ ابوالفضل اور غازی خان بدخشی نے صحیح توجیہات کیں، پھر جب نقیر سے پوچھا کہ ان واقعات کو کیونکر لکھا تو میں نے کہا کہ جو کچھ کتابوں میں دیکھا، لکھ دیا، میں خود ان واقعات کا موجد نہیں ہوں، اسی وقت کتاب روضۃ الاحباب اور سیر کی دوسری کتابوں کو خزانہ سے طلب کر کے نقیب خان کو حکم دیا کہ ان واقعات کی تحقیق کریں، اس نے واقعہ کے مطابق صحیح نقل کر دیا اور مجھکو ان بے محل اعتراضات سے خدا کے فضل سے رہائی ہوئی، ۳۶ سال کے متعلق حکم ہوا کہ اب ملا احمد ٹھٹھ تنہا تاریخ الفی لکھیں اور یہ حکم حکیم ابوالفتح کی سفارش سے ہوا، اور انھوں نے تعصب کی وجہ سے اپنے اعتقاد کے مطابق جو کچھ چاہا لکھ دیا، جیسا کہ ظاہر ہے چنگیز خان کے زمانہ تک کے تمام واقعات کو دو جلدوں میں تمام کیا، یہانتک کہ مرزا فولاد برلاس نے ایک رات اس کو بادشاہ کے طلب کرنے کے بہانہ سے گھر سے نکالا اور لاہور کی گلی میں اس غلو کی وجہ سے جو وہ مذہب میں رکھتا تھا، اور اس تکلیف کی وجہ سے جو اس کو اس سے ہوئی تھی، قتل کر دیا اور خود اس کے قصاص میں قتل ہوا، بقیہ احوال کو حکم کے موافق آصف خان نے نوسو ستانوے ۹۹۷ سال تک لکھا اور سنہ ایکہزار میں نقیر کو لاہور میں حکم دیا کہ اس تاریخ کو ابتدا سے مقابلہ اور تصحیح کروں، اور وہ سنہ جو آگے پیچھے لکھے گئے ہیں ان کو مرتب کروں، ایک سال تک اس خدمت میں مشغول رہ کر پہلی دو جلدوں کا مقابلہ کیا، اور تیسری جلد کو آصف خان کے حوالہ کیا،[1]

[1] بدایونی جلد ۲ ص ۳۱۹ — ۳۱۸

ابوالفضل نے آغاز کتاب میں ایک مقدمہ لکھا، [1] اس تالیف کی خوبی کو ایک انگریز مورخ اس طرح بیان کرتا ہے:-

"مولفین اس تالیف کی تیاری میں تمام بہترین ذرائع تصرف میں لائے ہیں، کیونکہ عربی اور فارسی کی ان تمام مشہور اور مستند تاریخوں کے حوالے جن سے آج موجودہ یورپین اہل علم فیض حاصل کر رہے ہیں، اس تالیف میں مذکور ہیں، انھوں نے بڑی دقت نظر کے ساتھ مستند مواد کا انتخاب کیا ہے، اور ان خرافات کو جو اکثر کتابوں میں پائے جاتے ہیں، نظر انداز کر دیا ہے۔" [2]

اکبر نامہ۔ تیموریوں کے دربار میں تاریخ نویسی اور واقعہ نگاری کا ایک باضابطہ محکمہ قدیم تھا، اکبر نامہ اور آئین اکبری اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہیں، اکبر نامہ ابوالفضل کی محنت و کاوش اور انشا کا شاہکار ہے، دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں بابر و ہمایوں کے حالات ہیں، دوسری جلد میں اکبری حکومت کے مفصل حالات ہیں، آئین اکبری کو اس کی تیسری جلد سمجھنا چاہیے، اکبر نامہ کے استناد کو بعض مورخین اس لیے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں کہ یہ اکبر کے ایک درباری مورخ کی نگارش و تحریر ہے، جس میں حد سے زیادہ خوشامد کا پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے،

الفنسٹن لکھتا ہے کہ

"اکبر نامہ کی سند یورپ میں وقعت کی نظر سے دیکھی نہیں جاتی ...... کیونکہ ابوالفضل گو وہ ایک وسیع النظر اور غیر معمولی ذہن کا آدمی ہے پھر بھی وہ ایک وفادار درباری ہے جو اپنے آقا کی نیکیوں کو ہمیشہ اچھالتا ہے، اس کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے،

---

[1] آئین اکبری ص ۷، [2] ایلیٹ ج ۵ ص ۱۵۶، انڈیا آفس کیٹلاگ نمبر ۱۱۴ - ۱۱۰۰۔

اور اس کے اور اس کے ہوا خواہوں کے رتبہ کو ہمیشہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے سنہ و تاریخ اور واقعات کے عمومی بیانات قابل قدر ہیں لیکن اس کتاب کو پڑھتے وقت اس کی علانیہ طرفداری سے اپنے کو اتنا محفوظ رکھنا نہیں پڑتا جتنا کہ وہ اپنے ممدوحین کی مدح سرائی کر کے ناظرین کی ہمدردی خواہ مخواہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اور پھر بعض موقع پر بے جا اور غیر ایماندارانہ طریقہ پر ایک قصہ لکھ کر کسی سے بدظن کر دیتا ہے، حالانکہ وہ شخص بالکل معصوم اور قابل معافی ہوتا ہے، اس کے بیانات گنجلک، غیر موثر، عامیانہ خیالات اور دعائیہ فقروں سے بریز، اور عموماً اپنے ممدوح کی مدح سرائی پر ختم ہوتے ہیں، وہ اکثر واقعات کو نظر انداز کر دیتا ہے، یا اپنے مخصوص انداز سے غلط پیرایہ میں بیان کر جاتا ہے، اور تعریف و توصیف، فتح و کامرانی کے واقعات کا تذکرہ اس غلو سے کرتا ہے کہ ناظرین نہ صرف کتاب سے بلکہ ممدوح سے بھی کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں؛ اس بے معنی تعریف و توصیف کے ڈھیر میں اکبر کے حقیقی اوصاف گم ہو جاتے ہیں، اور پھر دوسرے مورخوں سے اس کے افعال کی نوعیت کا، اس کی مشکلات اور ان ذرائع کا جن سے وہ ان مشکلات کو حل کرتا ہے، اصلی حال معلوم ہوتا ہے، کتاب کا خوشامدانہ انداز (جیسے ایسے آدمی نے لکھا، جو اکبر کی طبیعت سے خوب اچھی طرح واقف تھا، اور پھر اس کے معائنہ کے لیے پیش کیا) اس (اکبر) کی نخوت و کبریائی کا پتہ دیتا ہے جو حقیقتہً اس کی پسندیدہ سیرت کا تنہا داغ ہے"؛

مگر اس کا جواب ایک دوسرا یورپین مورخ اس طرح دیتا ہے:۔

"ابوالفضل پر یورپین مصنفین خوشامد پرستی کا الزام عائد کرتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ اس نے قصداً بعض واقعات کو چھپایا ہے، جس سے اس کے آقا کی شہرت کو کافی

نقصان پہنچا ہے، مگر اکبر نامہ کا مطالعہ کیا جائے تو الزام بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے، اگر اس کی تصنیف کا ہم مشرق کی دوسری تاریخوں سے مقابلہ کریں، تو پتہ چلے گا کہ وہ تعریف کرتا ہے، لیکن کم، اور خاص انداز کمال سے جو کوئی دوسرا ہندوستانی مورخ نہیں کر سکتا ہے، ملکی مورخوں میں سے کوئی اس پر خوشامد کا الزام عائد نہیں کرتا، اور اگر ہم یہ ذہن نشین کر لیں کہ مشرق کی تمام کتابیں حکمراں کی رائے سے متفق اور متبع ہونا ضروری قرار دیتی ہیں، خواہ وہ اچھی ہو یا بری، تو پھر ابوالفضل قابل معافی ہے، وہ اس لیے تعریف کرتا ہے کہ اس نے حقیقۃً ایک سچا ہیرو پا لیا ہے"۔[1]

اسی بات کو محمد حسین آزاد اپنے مخصوص انداز میں اس طرح لکھتے ہیں:-

"جن لوگوں کے دماغوں میں نئی روشنی سے اجالا ہو گیا ہے، وہ اس کی تصنیفات پڑھ کر یہ لکھتے ہیں، کہ ابوالفضل ایشیائی انشا پردازوں میں سب سے بڑا مبالغہ پرداز مصنف تھا، اس نے اکبر نامہ اور آئین اکبری کے لکھنے میں فارسی کی پرانی لیاقت کو تازہ کیا ہے، اس نے خوش بیانی اور یاوہ سرائی کے پردہ میں اکبر کی خوبیاں دکھائی ہیں، اور عیب اس طرح چھپائے ہیں کہ جس کے پڑھنے سے ممدوح اور مداح دونوں سے نفرت ہوتی ہے، اور دونوں کی ذات و صفات پر بٹہ لگتا ہے۔ البتہ بڑا علامہ، عاقل، دانا، مدبر تھا، دنیا کے کاموں کے لیے جیسی عقل کی ضرورت ہے، وہ اس میں ضرور تھی، آزاد کہتا ہے کہ جو کچھ الفاظ و عبارت کے پڑھنے والوں نے کہا یہ بھی ہے لیکن وہ مجبور تھا، کیونکہ فارسی کا ڈھنگ چھ سو برس سے یہی چلا آتا تھا، اس کی ایجادوں نے بہت اصلاح کی ہے، اور خرابیوں کو سنبھالا ہے، باوجود اس کے جو زبان کے ماہر ہیں، اور رموز سخن کے تاڑنے والے

---

[1] بلاخ مین تمہید آئین اکبری۔

ہین، اور کلام کے انداز اور ادا اون کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور سمجھتے ہین کہ جو کچھ کہا اور جس پیرایہ مین کہا، کوئی بات اٹھا نہیں رکھی، اصل حقیقت کو لکھ دیا ہے، اور انشا پردازی کا آئینہ اوپر رکھدیا ہے، کہ اسی کا کام تھا، یہ بھی اسی کا کام تھا کہ سب کچھ کہدیا، اور جن سے نہ کہنا تھا وہ کچھ بھی نہ سمجھے اور ابتک بھی نہیں سمجھتے، خوشامد کی بات ہم نہیں مانتے، ہر زبان کی تاریخیں موجود ہیں، کونسا مورخ ہے کہ خوشامد، ثنا، اور حمایت قوم سے پاک ہو، وہ اپنے آقا کا ایک نمک حلال وفادار نوکر تھا، اسی کے انصاف سے اس کے خاندان کی عزت وآبرو بچی، اسی کی قدردانی سے رکن سلطنت ہوگیا، اسی کی پرورش سے تصنیفات ہیں، اور انھوں نے بلکہ خود اس نے صدہا سال عمر پائی، خوشامد کیا چیز ہے؟ اس کا دل تو عبادت کرتا ہوگا، اور جان لوٹ لوٹ کر خاک راہ ہوئی جاتی ہوگی، اس نے بہت سا ادب ظاہر کیا، شکریہ ادا کیا، لوگوں نے خوشامد نام رکھا۔"[1]

ماثر الامرا، ابوالفضل کے انشا، اور اکبرنامہ کے متعلق لکھتا ہے:-

تمام چیزوں سے قطع نظر کر کے شیخ نے فن انشا مین عجیب سحر نگاری سے کام لیا ہے، باوجودیکہ وہ انشا پردازی کے تمام مصنوعی تکلفات سے پاک ہے، باینہمہ مفرد الفاظ کی نشست، ان کی متانت، حسن ترکیب وغیرہ کا ایک ایسا حصہ اس میں آگیا ہے کہ دوسرے لوگ بمشکل اس کی تقلید کرسکتے ہیں، اور تاریخ اکبری سے اسکی شہادت مل سکتی ہے چونکہ اس نے یہ التزام کرلیا ہے کہ (اس میں زیادہ تر فارسی کے الفاظ آئیں) اس لیے لوگوں کا بیان ہے کہ شیخ نے خمسۂ نظامی کی نثر کردی ہے، اس فن میں اس کی مہارت کا کمال یہ ہے کہ ہمت، مقصد مطلب سب کو جو بداہۃً باطل تھے، بادشاہ کی مداحی کے لیے بظاہر چند ایسی تمہیدوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جب تک غور نہ کیا جائے اصل مقصد معلوم نہیں ہو سکتا۔

---

[1] دربار اکبری، مطبع رفاہ عام لاہور، ص ۵۰۰۔

آئین اکبری۔ اکبرنامہ ہی کے مختلف حصے ہین، اس کی خوبیاں جتنی بھی زیادہ بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی، پھر بھی قلم قاصر رہے گا، ابوالفضل نے اسکو جس محنت کاوش، امعان نظر اور دیانتداری سے لکھا ہے، وہ ہر زبان کے لیے ایک قابل فخر علمی کارنامہ ہو سکتا ہے، اس کو تیموری دور کے ملکی، حربی، صنعتی، زراعتی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی، خانگی، علمی اور مذہبی حالات و واقعات کا آئینہ سمجھنا چاہیے، اگر یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو شاہان مغلیہ کے عہد زرین کے مختلف پہلوون کی تصویرین اتنی واضح اور روشن نظر نہ آتیں، جتنی کہ آج نظر آ رہی ہین، اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں جب برطانوی نظام حکومت قائم ہوا تو اس سلسلہ مین یہ کتاب بے حد معاون ہوئی؛

ان تاریخوں کے علاوہ نثر و نظم کی بہت سی کتابیں اکبر کی فرمایش پر لکھی گئیں، ملک الشعراء ابوالفیض فیضی فیاضی نے نظامی کے خمسہ کی زمین میں پانچ مثنویاں لکھیں، خسرو شیریں کے مقابل میں **سلیمان و بلقیس** اور لیلی و مجنون کے طرز پر **نل دمن** لکھی، ان دونوں میں علیحدہ علیحدہ چار ہزار اشعار تھے، ہفت پیکر کے وزن پر **ہفت کشور** اور سکندر نامہ کے جواب میں **اکبر نامہ** لکھی، جو پانچ ہزار شعروں پر مشتمل تھیں، مخزن اسرار کے مقابلہ میں **مرکز ادوار** لکھی جس میں تین ہزار ابیات تھیں،[1]

فیضی نے کلام مجید کی ایک بے نقط تفسیر **سواطع الالہام** بھی لکھی، جس کے صلہ میں اکبر نے دس ہزار روپئے دیے، اس نے اخلاقیات پر ایک بے نقط کتاب **موارد الکلام** بھی تالیف کی تھی،[2]

ارباب کمال

اس جماعت میں سب سے پہلے ہماری نظر ابوالفیض **فیضی** فیاضی پر پڑتی ہے جو شیخ مبارک کا خلف اکبر تھا، اس کے علم و فضل کی شہرت نے بیس برس کی عمر میں اسے اکبر کے دربار تک

[1] مآثر الامراء، ج ۲، ص ۵۸۷، [2] ایضاً ص ۵۸۸،

پہنچا دیا، جہاں وہ چہار صدی منصب پر فائز ہوا، اور جب تیس برس کا ہوا تو ملک الشعراء کے معزز خطاب سے سرفراز کیا گیا، عربی، فارسی اور سنسکرت کا جید عالم تھا، اس نے ایک سو ایک کتابیں مختلف زبانوں میں تالیف کیں، اس کی متعدد تصانیف کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کا علمی شغف اس قدر بڑھا تھا کہ جب وہ مرا تو اپنے کتب خانہ میں ۴۰۰۰ کتابیں چھوڑیں، جو شاہی کتب خانہ میں داخل کر لی گئیں، شاعری میں یکتائے روزگار تھا، پہلے فیضی پھر فیاضی تخلص کرتا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے،

زین پیش کہ سکہ ام سخن بود　　فیضی رقم نگین من بود

اکنون کہ شدم بعشق مرتاض　　فیاضیم از محیط فیاض

فیضی کے قصائد، غزلیں، اور مثنویاں فارسی کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہیں، اس کے کل کلام کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ ہے، اس کے مجموعہ کا نام طباشیر الصبح ہے، فن طب سے بھی دلچسپی رکھتا تھا، بو علی سینا کی کتاب القانون کو پڑھانے میں بڑی شہرت حاصل کی تھی، اکبر کا محبوب ترین دوست تھا، اس کو ہمیشہ پاس رکھتا تھا، اور اس کی ہمہ گیر قابلیت سے برابر فیضیاب ہوتا رہتا تھا، اکبر کے لڑکوں کی تعلیم اسی کے ذمہ تھی، شہزادہ دانیال کو تھوڑے ہی دنوں میں ضروری مراتب سکھا دیے تھے، دانیال نے برج بھاکا اسی سے سیکھی، ۲۵ھ جلوس میں اکبر نے اظہار عقیدت کے لیے شہزادہ دانیال کو اجمیر بھیجا تو فیضی کو بھی اس کے ساتھ متعین کیا، ۹۹۰ھ میں آگرہ کالپی اور کالنجر کی صدارت اس کو تفویض کی گئی، ۹۹۳ھ میں جب یوسف زئی پٹھانوں کے خلاف اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا، ۹۹۶ھ میں اکبر نے ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا، ۹۹۷ھ میں اکبر کشمیر گیا تو فیضی بھی اس کی معیت میں تھا، شاہی جلو میں کشمیر کی حسین وادیوں کو دیکھ کر مست ہو گیا، اور ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا،

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر — کہ بارعیش گشاید بہ خطۂ کشمیر

۹۹۹ھ میں اکبر نے خاندیس کے فرمانروا کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہاں سے احمد نگر برہان نظام شاہ کے پاس سفیر ہی کی حیثیت سے پہنچا، یہاں سے اکبر کے پاس جو عرضداشت لکھکر بھیجی، وہ مختلف قسم کے معلومات سے پر تھی، اس کو سیاسی کاموں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، وہ اکبر کے قریب رہ کر علمی مشاغل میں زندگی بسر کرنا زیادہ پسند کرتا تھا، شروع سے اخیر تک اکبر کے ساتھ اس کو خاص قلبی لگاؤ تھا، شاہ عباس صفوی نے اکبر کے پاس قیمتی تحائف لے کر اپنے ایک ایلچی کو بھیجا، تو موخر الذکر نے ایک مکتوب پڑھا، جس کے سرورق پر یہ رباعی تھی،

زنگی بسپاہ و خیل و لشکر نازد — رومی بسنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینۂ پر از زر نازد — عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

جب یہ رباعی پڑھی گئی تو دربار کا ہر شخص چونک اٹھا، اکبر نے فیضی کی طرف دیکھا، فیضی اپنے محبوب شاہی آقا کی سبکی برداشت نہ کرسکا اور فی البدیہہ یہ رباعی کہکر پڑھی،

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد — دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد — کونین بہ ذات پاک اکبر نازد

اس کو سنکر دربار میں مسرت و افتخار کی ایک لہر دوڑ گئی،[1] فیضی نے ۱۰۰۴ھ میں وفات پائی، جب بستر مرگ پر تھا تو ایک رات اکبر کو خبر ہوئی کہ وہ عالم نزع میں ہے آدھی رات گزر چکی تھی، مگر اکبر اپنے محبوب دوست کے گھر پر اسی وقت شاہی حکیم لیکر پہنچا، اضطراب میں فیضی کا سر پکڑ کر بولا، "شیخ جیو، بولو، حکیم علی کو ساتھ لایا ہوں، بولتے کیوں

---

[1] بیاض مرزا اسد بیگ ترکمان بحوالہ ہسٹری پرشین لٹریچر اینڈ لینگویج از عبد الغنی جلد سوم ص ۴۶،

نہیں ہو" مگر فیضی کی زبان بند ہو چکی تھی، اکبر نے پھر جھنجھوڑا لیکن اس مرتبہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی، غایت اضطراب اور صدمہ میں اکبر نے سر سے دستار اتار کر زمین پر پھینک دی۔[۱]

فیضی کی لیاقت، قابلیت، دقتِ نظر اور جودتِ طبع کے تمام اہل قلم معترف ہیں، ملا عبدالقادر بدایونی اس کو عقیدے کے لحاظ سے بہت ہی سخت اور برے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، مگر جہاں اس کی علمی لیاقت کا ذکر آتا ہے اس کی خوبیوں کی دل کھول کر داد دیتے ہیں، اس کی مثنوی نل ومن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس قسم کی کتاب تین سو سال کے اندر نہیں لکھی گئی، ایک جگہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشا، عدیل در روزگار نداشت"[۲]

مصنف مآثر الامراء اس کی قابلیت کے متعلق یوں رقمطراز ہے :۔

"بدقتِ طبع و جودتِ ذہن از جمیع علوم بخشی وافر برداشتہ، در حکمت و عربیت بیشتر تتبع نمودہ و پزشکی دانش فراہش گرفتہ رنجوران تہی دست را چارہ می کرد"[۳]

موجودہ دور کے ارباب کمال بھی اس کے کمال کے معترف ہیں، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے، جن کو اہل زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا، خسرو اور فیضی، مرزا صائب فیضی کی طرح پر غزل کہتے ہیں اور مقطع میں کہتے ہیں"

ایں آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت	در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ

..... فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر جوشِ بیان ہے، جس کا وہ موجد بھی ہے"

---

[۱] بدایونی جلد اول صفحہ ۱۴ و مآثر الامراء جلد ۲ صفحہ ۵۸۵ و شعر العجم جلد سوم، [۲] بدایونی جلد ۳ صفحہ ۲۹۹، [۳] مآثر الامراء، صفحہ ۵۸۵،

اور خاتم بھی، جوش بیان خواجہ حافظ میں بھی ہے، اور اعلیٰ درجہ پر ہے، لیکن رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص ہے، فیضی کے ہاں فخریہ عشقیہ فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین میں وہی جوش پایا جاتا ہے، جوش بیان اس کے ذاتی حالات کا خاص اثر ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔"[1]

محمد حسین آزاد گوہر افشاں ہیں :-

"انشاء پردازی فیضی کے قلم کو سجدہ کرتی ہے، اس کے لطیف استعارے، رنگین تشبیہیں، بلند مضامین، نازک خیالات، فصیح زبان، لفظوں کی عمدہ تراشیں، دلکش ترکیبیں، ادائے مطالب کے انداز دیکھنے کے قابل ہیں۔"[2]

فیضی کے بعد یکایک اس کے چھوٹے بھائی علامی فہامی شیخ ابوالفضل پر نظر پڑتی ہے۔ ابوالفضل نے ۱۵ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون کی تعلیم پا کر فراغت حاصل کر لی تھی، ۱۷ سال کی عمر میں آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھ کر اکبر کی خدمت میں گذرانی، فیضی شاہی بارگاہ سے منسلک ہو چکا تھا، اس کے ذریعہ ابوالفضل کی لیاقت اور ذہانت اکبر کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، چنانچہ تخت نشینی کے ۱۹ویں سال ابوالفضل شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا، پھر تو شاہی جود و کرم کی بارش اتنی ہوئی کہ وہ چار ہزاری منصب پر فائز ہوا، اور وزارت عظمیٰ پر مامور کیا گیا، وہ ایک کامیاب سیاست دان، بیدار مغز مدبر اور ہوشیار سپہ سالار ہونے کے علاوہ ایک بے مثل ادیب، مورخ اور شاعر تھا، اور علامی کے ممتاز لقب سے ہمیشہ یاد کیا جاتا تھا، اس کی قابلیت اور لیاقت ہر جگہ اور ہر زمانہ میں تسلیم کی گئی، صاحب مآثر الامراء لکھتا ہے کہ

---

[1] شعر العجم حصہ سوم ص۴۲، [2] دربار اکبری ص۳۰،

"بجودت طبع و رسائی فہم و علو فطرت و طلاقت لسان سرآمد زمانے یگانہ و بے ہمتائی وقت گردید"[51]

اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز جو فارسی کا بھی مسلم الثبوت استاد تھا لکھتا ہے کہ

"شیخ کی انشاپردازی اور مطلب نگاری کی تعریف نہیں ہوسکتی، یہ نعمت خداداد ہے کہ خدا کے ہاں سے اپنے ساتھ لایا تھا، ہر ایک مطلب کو اس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے کہ سمجھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے، بڑے بڑے انشاپردازوں کو دیکھو جہاں عبارت میں لطف اور کلام میں زور پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بہار سے رنگ لیتے ہیں اور حسن و جمال سے خوبی مانگ کر کلام کو رنگین و نمکین کرتے ہیں۔ یہ قادر الکلام اپنے پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اصلی مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ ہزار رنگینیاں ان پر قربان ہوتی ہیں، اس کے سادگی کے باغ میں رنگ آمیزی کا مصور قلم لگائے تو ہاتھ قلم ہوجائیں، وہ انشاء پردازی کا خدا ہے، اپنے لطف خیالات سے جیسی مخلوق چاہتا ہے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے، لطف یہ ہے کہ جس عالم میں لکھتا ہے نیا ڈھنگ ہے اور جتنا لکھتا جاتا ہے عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے، ممکن نہیں کہ طبیعت میں تھکن معلوم ہو۔"[52]

ایک انگریز مورخ اس کے انشاء کے متعلق اپنی رائے یوں ظاہر کرتا ہے:۔

"ابوالفضل کے طرز انشاپر کسی قسم کی رائے پیش کرنا بے سود ہے، عبداللہ شاہ بخارا کہا کرتا تھا کہ "وہ اکبر کے تیروں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ ابوالفضل کے قلم سے ڈرتا ہے" ہندوستان میں ہر جگہ وہ ایک زبردست منشی تسلیم کیا گیا ہے،

---

[51] مآثر الامراء حصہ دوم ص ۶۰۸۔ [52] دربار اکبری ص ۴۹۳۔

اس کے مکتوبات تمام مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں، اگرچہ ایک مبتدی ان کو پڑھنے میں مشکلوں اور پیچیدگیوں سے گھبرا جاتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ انشاء کے مکمل نمونے ہیں، ابوالفضل کی کتابوں سے لطف اٹھانے کے لیے نہ صرف فارسی زبان پر کافی عبور بلکہ خود ابوالفضل کے طرز انشاء پر کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اس کا طرز بے مثل ہے اور گو اس کی تحریر ہر جگہ پڑھی جاتی ہے، لیکن اس کا اتباع نہ کیا گیا ہے، اور نہ کیا جا سکتا ہے۔[۵]"

ابوالفضل کے مختلف تراجم، اور تاریخی شاہکار اکبر نامہ اور آئین اکبری کا ذکر آچکا ہے، انکے علاوہ انشائے ابوالفضل، کشکول، اور جامع اللغات بھی اس کی علمی یادگاریں ہیں، انشائے ابوالفضل اس کے خطوط کا مجموعہ ہے، یہ مجموعہ اب تک مختلف مدرسوں میں فارسی کے درس میں شامل ہے، کشکول میں ابوالفضل کے انتخاب کردہ نثر و نظم کے وہ نمونے ہیں جو اس نے یادداشت کے طور پر وقتاً فوقتاً لکھ لیے تھے، جامع اللغات میں وہ الفاظ مع معانی کے درج ہیں، جو ابوالفضل نے شاید طالب علمی کے زمانہ میں لکھے تھے،

ابوالفضل شہزادہ سلیم کے اشارے سے بندھیل کھنڈ کے ایک زمیندار بیر سنگھ کے ہاتھوں سنہ ۱۰۱۱ھ میں قتل ہوا، جب اس حادثہ کی خبر شاہی دربار میں پہنچی تو کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اس سانحہ کی خبر اکبر تک پہنچائے، آخرکار ابوالفضل کا وکیل سیاہ لباس پہنکر دست بستہ اکبر کے حضور میں آیا، چغتائی خاندان کے جب کسی شہزادہ کے انتقال کی خبر آتی تو اس کا وکیل باپ تک اسی طرح خبر پہنچاتا تھا، ابوالفضل کے وکیل کو جب اکبر نے دیکھا تو متحیر ہوگیا، خبر جانکاہ سنکر فرط غم سے نڈھال ہوگیا اور بولا

"اگر شاہزادہ را داعیۂ پادشاہی بود مرا کشتے، و شیخ را نگاہ داشتے"

---

۵ بلاخ من، تمہید آئین اکبری،

اور پھر یہ شعر پڑھا:۔

یہ شیخ ما: ز شوق بے حد چوں سوئے ما آمدہ ز اشتیاق پائے بوسی بے سروپا آمدہ[۱]

فیضی اور ابوالفضل کے سلسلہ میں ان کے باپ شیخ مبارک ناگوری کا ذکر بھی ضروری ہے، یہ خاندان ناگور، (نزد اجمیر) کا رہنے والا تھا، شیخ مبارک ناگوری نے گجرات میں خطیب ابوالفضل اور مولانا عماد طارمی سے علوم وفنون حاصل کیے تحصیل تعلیم کے بعد علوم دینیہ کا درس دینے کے لیے آگرہ میں قیام کیا، ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ شیخ ناگوری کی ابتدائی زندگی ریاضت، مجاہدہ، صلاح تقوی، توکل، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پابندی کے لیے مشہور تھی، استغنار کا یہ حال تھا کہ بادشاہوں کے دربار میں جانے سے ہمیشہ پرہیز کیا، اور زیادہ تر اوقات ریاضت یا علمی مشاغل میں بسر کیے، شاطبی شروع سے آخر تک یاد تھی، کلام پاک کو دس قرأت کے ساتھ حفظ کیا، کلام پاک کی ایک تفسیر چار جلدوں میں منبع نفائس العیون کے نام سے لکھی، ملا عبدالقادر بدایونی نے شیخ ناگوری سے آگرہ میں کئی سال تک تعلیم حاصل کی، وہ رقمطراز ہیں کہ

"ملائے بایں ہمہ جامعیت بنظر نیامدہ"

مگر جیسا کہ ملا صاحب کا بیان ہے کہ شیخ مبارک عمر کے آخری حصہ میں حب دنیا و حب جاہ کی خاطر جب اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے تو صراط مستقیم سے ہٹ کر محضر نامہ ترتیب دیا جس کے بعد دین الٰہی کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا[۲]

دربار اکبری کے علم وادب کے گلدستہ کا گل سرسبد عبدالرحیم خانخاناں بن بیرم خاں تھا، یہ صاحب قلم اور صاحب سیف دونوں تھا،

---

[۱] مآثر الامراء جلد دوم ص ۶۱۷، [۲] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۷۵-۷۳،

بیرم خان کے تعلقات شاہی دربار سے آخر میں خواہ کیسے ہی ہو گئے ہوں، لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت تھی کہ وہ ہندوستان میں تیموری سلطنت کے بانیوں میں سے تھا، اس نے اکبر کی دستگیری اور پشت پناہی اُس وقت کی جب وہ مشکلوں میں گھر کر بے پناہ ہو رہا تھا، احسان شناس اکبر نے بیرم خان کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے عبدالرحیم کو اپنی تربیتِ خاص میں لیا، اور اس کی پرورش اور تعلیم اپنی نگرانی کی، جب سن شعور کو پہنچا تو خان مرزا کے خطاب سے سرفراز کیا، تھوڑے دنوں میں وہ سپہ سالار بنکر خانخاناں ہوا[1]، ہم کو اس وقت اس کی شجاعت، تدبر، فتوحات اور جنگی معرکوں سے کسی قسم کی بحث نہیں، بلکہ ہم کو اس کے تبحر علمی، کمال انشا پردازی، علم دوستی اور ادب پروری پر کچھ روشنی ڈالنا ہے،

علمی حیثیت سے خانخاناں کا درجہ نہایت ہی ممتاز اور بلند تھا، دنیا کی اکثر مروج زبانوں پر مہارتِ تامہ رکھتا تھا، فارسی اس کی مادری زبان تھی، اس کی فارسی نثر اپنی سادگی، شستگی اور برجستگی کے لحاظ سے اب بھی بہت مقبول ہے، تزک بابری کا فارسی ترجمہ جو اس کے قلم کا رہینِ منت ہے، اب تک انشا کے لحاظ سے بے مثل چیز سمجھی جاتی ہے، اور ارباب ذوق اس کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس نے اپنے فارسی کلام کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا تھا، مگر وہ اب نایاب ہے، مآثر رحیمی میں جس کو خانخاناں کی زندگی میں عبدالباقی نہاوندی نے لکھا ہے، اس کے فارسی کلام کے کثرت سے نمونے درج ہیں،

خانخاناں کی سخن سنجی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ بڑے مشہور ہمعصر شعرا نظیری، عرفی، شکیبی، اور نوعی کے مقابلہ میں غزلیں کہتا اور بعض اوقات سب میں ممتاز رہتا تھا، اس کے

[1] تفصیل کے لیے دیکھو مآثر الامرا حصہ دوم ص ۶۹۲،

دربار میں برابر مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے، ایک بار طرح تھی، چند است پند است، فرزند است، تمام شعرائے اکبری نے اس زمین پر اپنا اپنا اشہب قلم دوڑایا، مگر میدان خانخاناں کے ہاتھ رہا، حتیٰ کہ نظیری بھی اس کے کلام کی صفائی، شستگی، دلآویزی اور سوز و گداز میں اس سے بازی لے جا سکا۔[۱] ہمارے ناظرین بھی اس غزل سے لطف اٹھائیں،

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند ست | جز این قدر کہ دلم سخت آرزومند ست

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست | نگاہ اہل محبت تمام سوگند ست

نہ دام دانم و نہ دانہ این قدر دانم | کہ پای تا بسرش ہر چہ ہست در بند ست

مرا فروخت محبت ولے ندانستم | کہ مشتری چہ کس ست و بہاے من چند ست

ادائے حق محبت عنایتے ست از دوست | وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خرسند ست

ازان خوشم بہ سخنہاے دلکش تو رحیم | کہ اندکے بہ اداہاے عشق مانند ست

خانخاناں عربی میں بھی اعلیٰ لیاقت رکھتا تھا، نہایت دقیق، مغلق اور مشکل عربی عبارت کے معنی نہایت آسانی سے بیان کر دیتا تھا، ایک بار شریف مکہ نے اکبر کو خط لکھا، عبارت اس قدر مشکل تھی کہ ابو الفضل اور فتح اللہ شیرازی کو مفہوم سمجھنے کے لیے لغت کی ضرورت ہوئی، خانخاناں نے اسے فوراً لیا، خط کی عبارت پڑھتا اور برجستہ ترجمہ کرتا جاتا تھا، جس کی داد تمام اہل دربار نے دی،[۲]

ترکی خانخاناں کی مادری زبان سمجھنا چاہیے، اس زبان میں اس کی لیاقت مسلم تھی، ہندی زبان کا پرگو شاعر تھا، اور سب سے زیادہ اسی زبان میں شاعری کی، مآثر رحیمی میں ہے :-

[۱] شعر العجم جلد سوم ص ۱۵ [۲] مآثر رحیمی، جلد دوم ص ۵۶۔

"در زبان ہندی ید بیضا نمودہ اند، چنداں اشعار متین و ابیات دلنشین کہ ایشان در آن زبان دارند ہیچ یک از فحول شعرائے آن زبان را نیست، دست از ثبت نمودن آنہا باز داشتہ باشعاری کہ بزبان فارسی فرمودہ اند اکتفا نمودہ و تجمل و انعام و احسانے کہ بشعرائے فارسی نمودہ برابر آن بہندی زبانان نمودہ باشند و چندان اشعار کہ آن جماعہ در مدح ایشان گفتہ اند فارسی گویان عشر عشیر نگفتہ اند"[1]

یہی مصنف ایک جگہ لکھتا ہے کہ اکبر کو سلاطین یورپ سے برابر مراسلت کرنی ہوتی تھی، اس لیے خانخاناں کو یورپین زبانوں کے سیکھنے کا حکم دیا، جن کو اس نے سیکھا، مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کن کن زبانوں سے اس نے واقفیت حاصل کی تھی، بہر حال وہ بہت سی زبانوں پر مہارت رکھتا تھا، مآثر الامراء میں ہے:-

"خانخاناں در قابلیت و استعداد یکتائے روزگار بود، و او عربی و فارسی و ترکی و ہندی روان داشت، شعر خوب می فہمید و می گفت، رحیم تخلص می کرد، گویند کہ با کثر زبانہا کہ در عالم رائج است حرف می زد"[2]

خانخاناں نے اپنے علمی ذوق کے نشو و نما کے لیے ایک بے نظیر کتبخانہ قائم کیا تھا، جس میں زمانہ کے مشہور شعراء نے اپنے دیوان خود لکھکر داخل کئے تھے، دربار اکبری کے اکثر باکمال اسی دار الحکمت کے تربیت یافتہ تھے، عرفی، شکیبی، حیاتی، ظہوری، ملک قمی، نظیری، محتشم کاشی، رسمی، نوعی شیرازی، ثنائی خراسانی، کفوی اور معزی وغیرہ جیسے بلند پایہ شعراء اس کی زرپاشیوں سے ہمیشہ فیضیاب ہوا کرتے تھے، اس کی علم پروری اور فیاضی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نوعی شیرازی نے

---

[1] مآثر رحیمی ج ۲ ص ۵۶۲، ہندی میں اس کی تصانیف کے نام حسب ذیل ہیں: (۱) دوہاولی (۲) نگر شوبھا (۳) بروے نایکہ بھید (۴) بروے (۵) شرنگار سورٹھا (۶) مدناشٹک (۷) رحیم کاویہ (۸) کھیٹ کوتک (۹) [illegible] رسالہ ہندوستانی جنوری ۱۹۳۲ء الہ آباد

[2] مآثر الامراء ج ۲ ص ۷۰۹

کو سونے میں تلوا دیا[1]، نظیری نے ایک بار کہا کہ اس نے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر نہیں دیکھا ہے۔ خانخاناں نے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر جمع کر کے دکھایا، پھر وہ ڈھیر اسکے گھر بھجوا دیا[2]، کہا جاتا ہے کہ ایک ہندی شاعر گنگ کوی کو اس نے ایک بار چھتیس لاکھ روپے انعام میں دیے، اس کی یہ غیر معمولی فیاضی باپ سے بھی وراثت میں ملی تھی، خانخاناں بیرم خان کو ہاشمی قندھاری کی ایک غزل بہت پسند آگئی اسنے ہاشمی کو ایک لاکھ سکہ دے کر یہ غزل اپنی طرف منسوب کر لی[3]۔

خانخاناں عبدالرحیم ہی کی طرح اکبری دربار کے ایک دوسرے عظیم المرتبت امیر **حکیم ابوالفتح گیلانی** نے بقول مولانا شبلی نعمانی مرحوم شاعری کی ایک اکیڈمی (بیت العلما) قائم کر رکھی تھی، اکبر کے مزاج میں حکیم ابوالفتح گیلانی کو وہی دخل تھا، جو جعفر برمکی کو ہارون رشید کے مزاج میں تھا، حکیم ابوالفتح نے آقا کی تقلید میں اپنے یہاں بھی علم وفن کی بزم اسی شاہانہ انداز میں گرم رکھی، اور اسی کی بدولت شعرا نے ایران میں بڑی ترقی کی، مولانا شبلی شعر العجم میں ابوالفتح کے مجموعۂ مکاتیب چہار باغ سے ایک خط نقل کرتے ہیں جو اس نے خانخاناں کو لکھا تھا۔

"قصائد کہ یاران آں جا گفتہ بودند، بشعراے ایں جا فرسودہ شد، بنام نامی شما ہر بہ اتمام می رسد، بملازمت فرستادہ خواہد شد، ملا عرفی، و ملا حیاتی بسیار ترقی کردہ اند"

[1] خزانہ عامرہ تذکرہ نوعی، [2] مآثر الامرا، حصہ دوم ۹ [3] ید بیضا ۲۱ (قلمی نسخہ دار المصنفین)، وہ غزل ملاحظہ ہو:

من کیستم عنان دل از دست دادۂ — وز دست دل بہ غم از پا فتادۂ
دیوانۂ دادر کمر کوہ گشتۂ — بے اختیار سر بہ بیابان فتادۂ
گاہے چو شمع ز آتش دل در گرفتۂ — گہ چون فتیلہ با دل آتش فتادۂ
بیرم ز فکر اندکے و بسیار فارغیم — ہرگز نگفتہ ایم کمی یا زیادۂ

مآثر رحیمی[1] کے مولف کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں اکثر شعرا خصوصاً خواجہ حسین ثنائی خراسانی، مرزا قلی میلی، فیضی، عرفی شیرازی، حیاتی گیلانی، مرزا نورالدین محمد قراری وغیرہ نے ابوالفتح گیلانی ہی کے یہاں تربیت پائی، اور یہ حکیم ہی کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا، کہ ان شعرا نے واقعہ گوئی، معاملہ بندی، خیال بندی، مضمون آفرینی، صنعت ایہام، استعارات، تشبیہات فلسفیانہ خیالات اور نئی نئی ترکیبوں میں طرح طرح کی جدت پیدا کی، جو اس زمانہ کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے،[2] حکیم ابوالفتح کی کچھ تصانیف بھی تھیں، فلسفہ و حکمت میں فتاحی اور قیاسیہ اور انشاء میں چار باغ اس کی طرف منسوب ہے،

ان ارباب کمال میں ملا عبدالقادر بدایونی کا درجہ علمی حیثیت سے کم ممتاز نہیں تھا، ملا صاحب ۹۸۱ھ میں شاہی دربار میں ملازم ہوئے،[3] عربی، فارسی، سنسکرت، تفسیر اور تاریخ کے جلیل القدر عالم تھے، اس لیے تصنیف و تالیف اور ترجمے کے کام پر مامور ہوئے، علاوہ تنخواہ کے وقتاً فوقتاً انعامات و اکرامات سے مالامال ہوتے رہے، آواز بڑی شیریں اور دلکش پائی تھی، اس لیے شروع میں شاہی امام بھی مقرر ہوئے، ان کے مختلف تراجم اور تاریخ الفی کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان کے علاوہ اور بھی تالیفات ہیں، نجات الرشید،[4] کتاب الاحادیث[5] اور منتخب التواریخ،

ملا صاحب کی تمام تصانیف میں منتخب التواریخ نے بڑی شہرت حاصل کی ہے، یہ تین حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں اکبر کے قبل سلاطین ہند کے کوائف ہیں، دوسرے میں اکبر کے حالات ہیں، تیسرے میں علماء، فقراء اور شعراء کا ذکر ہے، الیٹ اس تاریخ

---

[1] مآثر رحیمی ج ۳ ص۱۴۸، و شعر العجم حصہ ۳ ص۱۲، [2] بدایونی ج ۲ ص۱۶۲، [3] ایضاً ص۲۰۸، اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ میں موجود ہے [4] ایضاً ج ۱ ص۶۰،

کے بارے میں لکھتا ہے :-

"یہ ان چند کتابوں میں ہے جن کا ترجمہ بہت مفید ثابت ہوگا، لیکن اس کیلئے فارسی زبان میں کافی مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہمعصر تاریخوں سے کامل واقفیت بھی چاہیے، کیونکہ مصنف نہ صرف نامانوس الفاظ استعمال کرتا ہے بلکہ مذہبی مناظرے، تعریف و توصیف، ہجو و ذم، ذاتی اور خاندانی تاریخوں کی تفصیلات تو اس طرح بیان کرنے لگتا ہے کہ واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہتا، اور پھر سلسلۂ تاریخ قائم کرنے میں کافی دقت ہوتی ہے لیکن ہمیں اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی غیر متعلقات اس کی تصنیف کے دلچسپ حصے ہیں، بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں، جو بدایونی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، خصوصاً جو شاہی کانوں کو ناگوار ہوں یا جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس وضاحت اور بے توجہی کے ساتھ آشکارا کر دیتے ہوں"[1]

محمد حسین آزاد نے ملا صاحب سے اس لیے خوش نظر نہیں آتے ہیں کہ وہ ان کے ممدوحین کو اچھے الفاظ سے نہیں یاد کرتے ہیں، اس کتاب کی سب سے "بڑی خوبی" یہ بتائی ہے کہ ملا صاحب نے اس تاریخ میں غیر کی یا اپنی کوئی بات چھپائی نہیں[2]

اس کتاب کی صاف گوئی اور حق پسندی کے سبب جہانگیر نے اپنے زمانہ میں اس کی اشاعت بند کر دی تھی، بات یہ تھی کہ ملا صاحب بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے جس بات کو خلاف شرع و مذہب سمجھ لیتے تھے، پھر اس کے دیکھنے کے روادار نہ تھے، اکبر کے مذہبی خیالات کو نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے، اور جو لوگ اکبر کے خیالات میں ان تبدیلیوں کے باعث ہوئے تھے، ان کو کاذب، ملحد، کافر، ملعون، بے دین، زندیق، بدبخت کے الفاظ سے

---

[1] الیٹ ج ۵ ص۴۸۴، [2] دربار اکبری ص۱۴۳،

یاد کرتے، اور ان تمام خیالات کو اسلام کی اہانت اور مسلمانوں کی مذلت بلکہ جان و مال کے نقصانات کا سبب قرار دیتے ہیں، اسی لیے فیضی اور ابو الفضل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں، مگر باوجود ان کے سخت عقائد کے ان کے علمی تبحر کو سب تسلیم کرتے تھے، عظیم الشان علمی کاموں کے لیے شاہی دربار سے ہمیشہ ملک الشعرا فیضی یا علامہ ابو الفضل، یا ملا عبد القادر منتخب کیے جاتے تھے، اکثر تینوں یا ملا صاحب ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ مل کر علمی کارنامے انجام دیتے تھے، فیضی ملا صاحب کی قابلیت کا بہت معترف تھا، کچھ دنوں اکبر نے ملا صاحب کی طرف سے بے التفاتی برتی تھی، اس پر فیضی نے بارگاہ شاہی میں ایک عریضہ لکھا، جس میں اکبر سے خطا پوشی اور عطا پاشی کی درخواست کی، پہلے ملا عبد القادر کی لیاقت و قابلیت کا ذکر اس طرح کرتا ہے:-

"دانشمند شکستہ نیاز ملا عبد القادر اہلیت تمام دارد و علوم رسمی انچہ ملایان ہندوستان می خوانند خواندہ پیش خدمت ابوی کسب فضیلت کردہ و قریب بہ سی و ہفت سال میشود کہ بندہ او را می دانم و باضمیمہ فضیلت علمی طبع نظم و سلیقہ انشائے عربی و فارسی و چیزے از نجوم و بہرہ از حساب دارد و از ہر جنس وقوف در نغمہ ولایت و ہندی و خبرے از شطرنج صغیر و کبیر دارد و مشق بین بقدری کردہ باوجود بہرہ مند بودن ازیں ہمہ فضائل بہ بے طمعی و قناعت و کم تردد نمودن و راستی و درستی و ادب و نامرادی و شکستگی و گذشتگی و بے تعینی و ترک اکثر رسوم تقلید و درستی اخلاص و عقیدت بدرگاہ بادشاہی موصوف است۔"

پھر اس کی سفارش ان الفاظ میں کرتا ہے:-

چوں درگاہ راستان است دریں وقت کہ بے طاقتی زور آوردہ بندہ خود را

حاضر پایۂ سریر والا وانستہ احوال او بعرض رسانید اگر دریں وقت بعرض نمی رسانید نوعی از ناراستی و بے حقیقی بود حق سبحانہ بندہا سنہ درگاہ را در سایہ فلک پایۂ حضرت پادشاہ بر راہ راستی و حق گذاری وحقیقت شناسی قدم ثابت کرامت فرماید وآں حضرت را بر کل عالم و عالمیاں سایہ گستر و شکستہ پرور و عطاپاش و خطاپوش بہزاران ہزار دولت و اقبال و عظمت و جلال دیرگاہ داراد بعزت پاکاں درگاہ الٰہی و روشن دلان سحرخیز صبح گاہی آمین آمین۔[1]"

بعد کے اہل علم نے بھی ملا صاحب کی تعریف بجا طور پر کی ہے۔ بختاور خان عالمگیری مرأۃ العالم میں لکھتا ہے:۔

"ملا عبد القادر بدایونی جامع معقول و منقول بود و با فضیلت علمی طبع نظم و سلیقہ انشائے عربی و فارسی و نجوم و حساب و وقوف در نغمہ ولایتی و ہندی بمرتبہ کمال داشت وقادری تخلص بود۔"

علم و ہنر کے آسمان کا ایک دوسرا درخشندہ ستارہ خواجہ نظام الدین احمد تھا، خواجہ نظام دربار اکبری کے پنجہزاری امرا میں تھا۔ جو اس عہد کی بڑی معراج تھی، گجرات میں بخشی کے عہدہ پر مامور تھا، صاحب ثروت و عزت ہونے کے ساتھ صاحب قلم بھی تھا، سنہ ۱۰۰۲ھ میں طبقات اکبری لکھی جس نے اس کو حیات جاوداں بخشی، یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی عہد کی بہت ہی جامع تاریخ ہے، مصنف نے اپنی معلومات ان تمام مستند ماخذوں سے حاصل کیے ہیں۔ جو اس وقت ممکن صورت سے دستیاب ہو سکتے تھے، کتاب کے آغاز میں اپنے ماخذوں کے جو نام گنائے ہیں ان کی تعداد تیس ہے، اسی لیے یہ کتاب ہمیشہ

---

[1] بدایونی جلد ۳ ص ۵-۴۰۴ [2] منتخب اللباب خافی خان جلد ۱ ص ۲۴۳،

مستند تاریخوں میں شمار کی گئی ہے، ملا عبد القادر بدایونی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ اسی کی مدد سے تیار کی، تاریخ سلاطین افغانان کے مصنف نے تو بعض بعض حصے خصوصاً ہمایوں کے حالات لفظ بلفظ اسی سے نقل کر لیے ہیں، فرشتہ نے اس کو ایک مکمل تاریخ بتایا ہے، اور اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، مآثر الامرا میں ہے،

چونکہ مصنف نے واقعات کی تنقیح میں باریک بینی، جزئیات کے استقصا اور معلومات کے جمع کرنے میں پوری کوشش کی ہے، اور میر معصوم بھکری وغیرہ جیسے اہل کمال اس تالیف میں شریک تھے، اس لیے وہ نہایت معتبر ہے، اور وہ پہلی تاریخ ہے جو ہندوستان کے تمام اسلامی بادشاہوں کے حالات کی جامع ہے، اور تاریخ فرشتہ کے مصنف اور اسکے تتبع کرنے والوں کا جنھوں نے ابھی حالات کا اضافہ کیا ہے، مرغوب ماخذ یہی کتاب ہے[۱]

منتخب اللباب حصۂ اول میں ہے،

نظام الدین ہروی محمد اکبر بادشاہ کا بخشی تھا، اس نے ایک تاریخ لکھی جس میں صوبہ دکن کے اکیس بادشاہوں کے حالات تھے، اس کا نام تاریخ نظامی رکھا، اس میں ۱۰۰۳ھ تک اکبر بادشاہ کا ذکر کیا ہے، اکثر سلاطین دکن کے حالات میں اس کا بیان اعتماد کے لائق نہیں ہے، محمد قاسم فرشتہ کے علاوہ جس مورخ نے بھی سلاطین دکن کا حال لکھا ہے، اس کا بیان قابل اعتبار نہیں، لیکن چونکہ نظام الدین نے اکبر بادشاہ کی خدمت میں عمر صرف کر دی تھی، اس لیے اس بادشاہ کی سلطنت کے حالات میں وہ قابل وثوق ہے،[۲]

یورپین مورخین میں یہ کتاب بہت مقبول ہے، ارسکن کا خیال ہے کہ اس زمانہ کا بہترین

---

[۱] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۲۶۳ [۲] خافی حصہ اول ص ۲۳۰،

مورخ نظام الدین تھا، کرنل لیس کو افسوس ہے کہ اس کتاب کو اتنی مقبولیت نہیں ہوئی جتنی چاہیے تھی، الیٹ لکھتا ہے کہ یہ ہندوستان کی بہت ہی مشہور کتاب ہے، جو جدید طرز پر لکھی گئی ہے۔[1]

خواجہ نظام الدین کا انتقال ہوا تو ملا عبد القادر بدایونی نے اس طرح ماتم کیا جو ان کی مقبولیت کی دلیل ہے،

> وہ تپ محرقہ میں ۵۴ سال کی عمر میں جان بحق ہوا، اور نام نیک کے سوا اپنے ساتھ کچھ نہیں لے گیا، دوست و احباب نے جو اس کے حسن و اخلاق کو دیکھ کر بڑی امیدیں رکھتے تھے، اشک حسرت بہائے اور سینے پر نا امیدی کے پتھر رکھے، اس حقیر کو بھی اس سے بڑا دینی اخلاص تھا، اور کوئی دنیاوی غرض وابستہ نہ تھی، مجبوراً صبر و تحمل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں پایا، اور یہی پرہیزگاروں کا شیوہ ہے، مگر اس واقعہ کو سب سے بڑی مصیبت سمجھ کر اس سے پوری عبرت حاصل کی، اور پھر کسی انسان سے محبت نہیں کی، اور گمنامی کے گوشہ میں بیٹھ رہا،[2]
>
> بدایونی نے وفات کی تاریخ کہی، ع گوہرِ بے بہا ز دنیا رفت۔[3]

فضلاء، اکبر کے دربار کے فضلاء کی فہرست اتنی طویل ہے، کہ اگر ہم ان کو تفصیل سے بیان کرنا شروع کریں تو ایک علٰحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی، ملا عبد القادر بدایونی نے اس عہد کے مشائخ، فضلاء، اطباء اور شعراء کا ذکر ایک مستقل جلد میں کیا ہے، جو ۲۹۰ صفحوں پر مشتمل ہے، ہم ان میں سے بعض ارباب علم و اصحاب فن کو ناظرین سے روشناس کر کے ان کی تشنگی بجھانے کی کوشش کریں گے۔

---

[1] الیٹ ج ۵ ص ۱۷۷، [2] بدایونی ج ۲ ص ۳۹۶، [3] ایضاً

میر فتح اللہ شیرازی۔ کبھی میر، کبھی امیر، اور کبھی شاہ ان کے نام کا جزء تھا، شیراز سے بیجاپور آئے، اور ابراہیم عادل شاہ کے لڑکے علی عادل شاہ کے معلم مقرر ہوئے، ان کے فضل و کمال کی شہرت پورے ہندوستان میں گونجی، فیضی دکن پہنچا تو ان سے ملا، اور اسی کی وساطت سے اکبر کے دربار سے متوسل ہوئے، بیجاپور سے اکبر کے دار السلطنت کے قریب پہونچے، تو اکبر نے خانخاناں عبد الرحیم اور ابو الفتح گیلانی کو ان کے استقبال کے لیے بھیجا، اور خود ان سے بڑی عزت و تکریم کے ساتھ پیش آیا، صدارت کے منصب پر سرفراز کر کے پرگنہ بساور، بیدا ۱؎ در محلی جاگیر میں عطا کئے، ترقی کر کے سہ ہزاری منصب پر بھی فائز ہوئے، تفسیر، کلام، حدیث، حکمت، ہیئت، ہندسہ، نجوم و رمل اور حساب میں ان کی علم دانی کا پایہ بہت بلند تھا، اپنے نجوم و رمل کے کمالات سے اکبر کے زائچہ کی تصحیح کی، اکبر کی فرمایش سے ایک نئے سنہ کی داغ ڈالی، جس کا نام سنہ الٰہی اکبر شاہی قرار پایا، ۹۹۳ھ میں امین الملک بنائے گئے، اور راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ امور سلطنت کے انصرام میں مصروف ہوئے، دفتر مال و دیوانی کی بہت سی اصطلاحات ان ہی کی وجہ سے رائج ہوئیں، اسی سال اکبر نے ان کو عضد الدولہ کے خطاب سے سرفراز کر کے خان اعظم کے ساتھ دکن بھیجا، تاکہ اس صوبہ کو سلطنت تیموریہ کے زیر نگیں کرنے میں معاون ہوں، یہ مہم ناکام رہی، اکبر جب ۹۹۳ھ میں کشمیر پر حملہ آور ہوا تو شاہ فتح اللہ بھی اس کی معیت میں تھے، اور برابر مجلس مشورت میں شریک ہوتے تھے، ۹۹۷ھ میں اکبر کابل سے کشمیر جا رہا تھا، تو شاہ صاحب بھی شاہی جلو میں تھے، راستے میں یکایک تپ محرقہ میں مبتلا ہوئے، اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی، اکبر ان کی موت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا اور بار بار کہتا تھا کہ

"میر وکیل و حکیم و طبیب و منجم ما بود"

فیضی نے ان کی موت پر ایک غمناک مرثیہ کہا جس میں ۱۰۴ اشعار تھے، وہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے انجنیر اور موجد بھی تھے، ایک ایسی چکی بنائی تھی جو خود بخود ہوا سے حرکت کرتی تھی، ایک آئینہ بھی ایجاد کیا تھا جو نزدیک اور دور کے عجیب و غریب تماشے دکھاتا تھا، ایک قلعہ شکن توپ بنائی تھی جو جوڑیوں کی طرح الگ الگ ہو جاتی تھی، ایک ایسی بندوق بھی تیار کی تھی جو ایک ہی بار بارہ گولیاں چلاتی تھی، معاصر اہل علم ان کے علمی پایہ کے معترف تھے، طبقات اکبری میں نظام الدین احمد لکھتا ہے :-

امیر فتح اللہ (با آن کہ در جمیع علوم عقلی و نقلی در ایران و ہند بل در ربع مسکون قرین خود نداشت) از نیرنجات و طلسمات ماہر بود،

ان کے نام سے یہ تصانیف منسوب ہیں (۱) تفسیر منہاج الصادقین فی الزام المخالفین (۲) خلاصۃ المنہج (۳) اقبال نامۂ اکبری (۴) حالات کشمیر (۵) زیچ جدید، تاریخ الفی کی تدوین میں بھی شریک رہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے[۱]۔

مولانا عبد اللہ سلطانپوری، سلطان پور مضافات لاہور کے رہنے والے تھے، اپنے عہد کے جید علماء میں سے تھے، عربی، اصول، فقہ، تاریخ اور علوم منقولات میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، ان کی تصانیف میں عصمۃ انبیاء، شرح شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، شرح ملا مشہور تھیں، تیموریوں سے پہلے سلاطین افغانان بھی ان کے بڑے قدردان تھے، شیر شاہ نے ان کو صدر الاسلام کا خطاب بخشا تھا، سلیم شاہ نے اپنے تخت پر ساتھ بٹھا کر ان کی خدمت میں بیس ہزار روپے کی ایک مروارید کی تسبیح پیش کی تھی، ہمایوں نے ازراہ قدردانی ان کو مخدوم الملک

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھو اکبرنامہ ج ا ص ۳۱ و ج ۳ ص ۵۰۰، ۴۰۱، ۳۹۱ منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۷۰ - ۳۱۰ - ۳۱۶ - ۳۱۵، ماثر الامراء ج ا ص ۴ - ۱۰۱ و معارف نمبر ۵ ج ۱۸،

اور شیخ الاسلام کے القاب عطا کئے تھے، وہ اہل سنت والجماعت میں سے تھے، اور ہر حال میں شریعت کی پابندی کا لحاظ رکھتے تھے، بیرم خاں نے ایک لاکھ روپے سالانہ تنخواہ مقرر کی تھی، اکبر کے زمانہ میں شاہی دیوان خانہ کے وکیل تھے، اور رجب ۹۹۰ھ میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے ذاتی خزانہ سے تین کرور روپے نکلے،[1] اکبر کی حمایت میں جو محضر نامہ ترتیب دیا گیا تھا، اس پر طوعاً و کرہاً انھوں نے بھی اپنا دستخط ثبت کیا تھا، محضر نامہ کی تدوین کے بعد ان کے اور اکبر کے تعلقات اچھے نہیں رہے،

مولانا میر سید محمد میر عدل۔ امروہہ کے رہنے والے تھے، علم حدیث میں مولانا میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے، اپنے علم کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ کے لیے بھی مشہور ہوئے، اکبر نے اپنے دربار سے منسلک کرکے ان کو میر عدل کے عہدہ پر مامور کیا، اور جب تک وہ اس عہدہ پر رہے ملک سے خیانت اور الحاد کا انسداد کرتے رہے، ۹۸۴ھ میں بھکر کی حکومت ان کو تفویض کی گئی، ۹۸۶ھ میں جوار رحمت حق سے پیوست ہوئے،[2]

شیخ عبد النبی۔ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ کے پوتے اور حضرت شیخ احمدؒ کے لڑکے تھے، مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں علم حدیث کی تعلیم حاصل کی، ہندوستان واپس آئے تو اپنے تقویٰ، طہارت، نزاہت اور عبادت کے لیے مشہور ہوئے، اکبر نے متاثر ہو کر ان کو عہدۂ صدالصدور پر فائز کیا، ملا عبد القادر بدایونی کا بیان ہے کہ کسی سلطنت میں منصب صدارت کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ شیخ عبد النبی کے زمانہ میں ہوئی،

"چوں بمنصب صدارت رسید جہان جہان زمین مدد معاش و وظائف و اوقاف بخلاق بخشید، چنانچہ درزمان ہیچ پادشاہی ایں چنیں صدری باستقلال نگشتہ و عشر عشیر

---

[1] بدایونی ج ۳ ص ۷۰، ماثر الامراء ج ۳ ص ۲۵۶، و تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۳ [2] الضاً ص ۷۷،

ایں اوقات کرا ودادہ نداده"

اکبر کو شیخ عبد النبی سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، ان کے گھر جاکر ان سے حدیث پڑھتا تھا، اور ان کے فیضِ صحبت سے اس کی مذہبی خود رفتگی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مسجد میں خود اذان دیتا، اور ثواب کی خاطر مسجد میں جھاڑو بھی دیتا تھا، ایک دفعہ اس نے سالگرہ کی تقریب میں کپڑوں پر زعفران کا رنگ چھڑکا، شیخ عبد النبی نے دیکھا تو اس قدر برہم ہوئے کہ سرِ دربار لکڑی اٹھا کر ماری، اکبر کو ناگوار ہوا، محل میں جاکر ماں سے شکایت کی کہ شیخ خلوت میں منع کرتے تو کوئی ہرج نہ تھا، دربار میں ذلیل کرنا مناسب نہ تھا، مریم مکانی نے کہا "بیٹا دل پر میل نہ لانا، یہ نجات اخروی کا باعث ہے، قیامت تک چرچا رہے گا کہ ایک مفلوک الحال ملّا نے بادشاہ کے ساتھ یہ حرکت کی، اور سعادتمند بادشاہ نے اس کو برداشت کیا"[1] مگر بعض مقربان بارگاہ نے اکبر کو شیخ کی مذہبی سختی کے خلاف ابھارا تو اس کی یہ عقیدت کدورت میں تبدیل ہوگئی، جب محضر نامہ کا فتنہ اٹھا تو شیخ عبد النبی نے بجبر واکراہ اس پر دستخط کیا، اکبر کی ناگواری اور بھی بڑھی، اور اس نے شیخ کو حج بیت اللہ کے لیے جانے پر مجبور کیا، اور خواہش کی کہ وہ وہاں سے واپس نہ آئیں، مگر شیخ کچھ دنوں کے بعد حج سے واپس آگئے، جس سے اکبر کی کدورت میں اور بھی اضافہ ہوگیا، اکبر نے ان کو قید کردیا اور وہ قید خانہ ہی میں ۹۹۱ھ میں عالم بقا کو سدھارے، ان کی ایک تالیف وظائف النبی صلعم کا قلمی نسخہ دار المصنفین (اعظم گڈھ) میں ہے، سماع کے انکار میں بھی ایک رسالہ لکھا، امام قفال مروزی شافعی نے امام ابو حنیفہ کے خلاف جو طنز کیا ہے اس کے رد میں بھی ایک رسالہ تحریر کیا،[2]

مشہور شیعی عالم قاضی نور اللہ شستری (مؤلف مجالس المومنین) بھی دربار سے

---

[1] مآثر الامرا جلد دوم ص ۵۶۰، [2] منتخب التواریخ جلد دوم، ص ۸۳-۷۹، و تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۲،

وابستہ تھے، وہ اپنے علم، حلم، نیک نفسی، زہد، تقوی، اور جودت فہم کے لیے مشہور تھے، اکبر نے ان کو لاہور کا قاضی مقرر کیا، جہاں ان کی دیانت اور عدل پروری کا ہر شخص معترف تھا،

شاہی دربار کے بہت سے اطبا ایسے بھی تھے جو صرف اپنے فن میں یدطولیٰ رکھتے تھے بلکہ مختلف علوم پر بھی ان کو بڑی دستگاہ حاصل تھی، حکیم ابوالفتح گیلانی کا ذکر پہلے آچکا ہے، حکیم الملک شمس الدین اپنے زمانہ کا جالینوس تھا، علم منقولات میں بھی اس کی لیاقت مسلم الثبوت تھی، حکیم عین الملک شیرازی علم کحل کا بڑا ماہر تھا، شعر و شاعری سے بھی اسکو دلچسپی تھی، تخلص دوائی رکھتا تھا، حکیم مصری کو علم حروف و تکسیر و توفق میں بڑی مہارت تھی، کبھی کبھی شعر بھی کہتا تھا، حکیم علی گیلانی حکیم الملک کا بھانجہ تھا، اپنے خالو شاہ فتح اللہ شیرازی سے طب کی تعلیم پائی، اور شیخ عبدالنبی سے علوم منقولات حاصل کیے، جہانگیر اس کی عربی دانی کا بہت معترف تھا، اس نے قانون کی ایک شرح بھی لکھی، حکیم ہمام حکیم ابوالفتح گیلانی کا بھائی تھا، اس کا اصل نام ہمایوں تھا، اکبر کے دربار سے وابستہ ہوا تو ہمایوں کے نام کے احترام کی خاطر غایت خاکساری میں اپنے کو ہمایون قلی کہنے لگا، مگر اکبر نے اس کا نام ہمام رکھا، جس کے معنی بلند مرتبہ سردار کے ہیں، اکبر اس کو بہت عزیز رکھتا تھا، اور گو شش صدی منصبدار رہا لیکن دربار کا بہت ہی باثر اور بارسوخ امیر تھا، تاریخ الفی کی تدوین میں حکیم علی اور حکیم ہمام بھی شریک تھے، وہ توران شاہی سفیر بنا کر بھیجا گیا، وفات کے بعد بہت بڑی دولت چھوڑی، حکیم احمد ٹھٹھوی، حکیم لطف اللہ گیلانی، حکیم مظفر اردستانی، شیخ بنا، اور حکیم مسیح الملک شیرازی بھی ذی علم فضلا میں شمار کیے جاتے تھے، (دیکھو منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۷۰۔ ۱۶۱ و طبقات اکبری جلد ۳ ص ۸۴ و ۳۸۱)

ہم طوالت کے خیال سے تمام علما و فضلا کا ذکر کرنے سے قاصر ہیں، ابوالفضل نے آئین اکبری میں "دانش اندوزان جاوید دولت" کے عنوان سے ان کی پانچ

قسمیں کی ہیں،

(۱) **خدیونشاتین** - جس میں شیخ مبارک ناگوری، شیخ نظام نارنولی، شیخ ادہن ابن اللہ، میاں وجیہ الدین، شیخ رکن الدین، شیخ عبد العزیز، شیخ الہدیہ، شیخ عبد الغفور، وغیرہ تھے،

(۲) **خداوند باطن**، شیخ رکن الدین محمود کنا نگر، شیخ امان اللہ، خواجہ عبد الشہید، شیخ موسیٰ، شیخ علاء الدین مجذوب، شیخ سلیم چشتی، شیخ محمد غوث گوالیاری وغیرہ،

(۳) **دانندۂ معقول ومنقول**، میر فتح اللہ شیرازی، میر مرتضیٰ، مولانا سعید ترکستانی، حافظ تاشکندی، مولانا شاہ محمد، مولانا علاء الدین، حکیم مصری، مولانا صادق وغیرہ،

(۴) **شناسای عقلی کلام**، مولانا پیر محمد، مولانا عبد الباقی، مرزا مفلس، مولانا محمد، مولانا نور الدین ترخان وغیرہ،

(۵) **پزشکان**، حکیم مصری، حکیم الملک، حکیم ابو الفتح گیلانی، حکیم علی گیلانی، حکیم ارسطو، حکیم مسیح الملک، حکیم لطف اللہ، حکیم ہمام، حکیم شفائی، شیخ بینا وغیرہ،

خوانای نقلی مقال، میاں حاتم، مولانا عبد القادر، مخدوم الملک، میر عبد اللطیف، میر نور اللہ، شیخ عبد النبی صدر جہاں۔ شیخ منوّ وغیرہ،

ان کے علاوہ اس عہد میں بہت سے اور صلحا وعلما بھی تھے، مثلاً شیخ عبد الحق دہلوی، حاجی ابراہیم محدث، شیخ جلال الدین تھانیسری، شیخ نظام الدین امیٹھوی، شیخ داؤد جہنی والؒ وغیرہ جن کے فیوض وبرکات سے عوام وخواص متمتع ہوتے رہے، مگر پھر بھی علمائے سو کی فتنہ سامانیوں سے اس دور میں ضلالت وگمراہی اتنی بڑھی کہ افق اسلام پر حضرت **امام ربانی مجدد الف ثانیؒ** کا ظہور ہوا اور اس مجدد اعظم نے ہندوستان کے ظلمت کدہ کی تیرگی وتاریکی کو اسلام کی ضیا پاشی سے ایک بار پھر منور کر دیا۔

شعراء | اکبر کی فیاضیاں اور زرپاشیاں سنکر ہر جگہ سے شعراء ہندوستان میں امنڈ آئے تھے، ملا بدایونی نے اس عہد کے ایک سو چھ(۱۰۶) شعراء کے حالات لکھے ہیں، اور ان کے کلام کے نمونے درج کئے ہیں، ابوالفضل نے آئین اکبری میں بہتر اور خواجہ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں اکاشی ایسے شعراء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے دربار میں پہنچکر تقرب حاصل کیا، اکبر نہ صرف ان پر ہسیم وزر کی بارش کرتا، بلکہ ان کی ہمت افزائی ا... ان کے ذوق سخن کے معیار کو بلند کرنے کی خاطر ملک الشعراء کا خاص عہدہ قائم کیا، جس پر سب سے پہلے غزالی مشہدی مامور ہوا، غزالی عراق سے ہندوستان آیا، تو اکبر کے درباری امیر خان زمان حاکم جون پور نے ایک ہزار روپے زاد راہ بھیج کر اس کو اپنے دربار میں بلایا، یہاں ایک مثنوی نقش بدیع لکھکر خان زمان کی خدمت میں پیش کی، جس میں ایک ہزار شعر تھے، سخن سنج اور سخن فہم خان زمان کو یہ مثنوی اس قدر پسند آئی کہ فی شعر ایک اشرفی انعام دیا،[1] خان زمان کی وفات کے بعد غزالی اکبر کے دربار سے منسلک ہوگیا، ابوالفضل نے اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:-

"یہ بلند فہمی و شیوا زبانی طراز یکتائی داشت و از دلاویز گفتار صوفی بہرہ مند"

(آئین اکبری ص۱۶۳)

ان ہی شاعرانہ اوصاف کی بنا پر اس کو ملک الشعراء کا خطاب دیا گیا، بہت ہی پرگو شاعر تھا کئی دیوان اور کئی مثنویاں مثلاً مشہد انوار، مرآۃ الصفات، نقش بدیع، اور قدرت آثار لکھیں، ملا بدایونی اسکی شاعری کے بہت زیادہ مداح نہیں، مگر اس کی شاعری کی کمیت و کیفیت کے معترف ہیں، لکھتے ہیں:-

---

[1] خزانہ عامرہ قلمی نسخہ بحوالہ شعر العجم حصہ سوم ص۱۰

"اگرچہ سخن او رتبۂ عالی چندان ندارد امادر کمیت وکیفیت اشعار او زیادہ از ہمہ اقرانست بزبان تصوف مناسبت تمام دارد" (جلد سوم ص۱۱)

۹۸۰ھ میں احمد آباد میں وفات پائی، اور سلاطین و مشائخ کے مقبرہ میں دفن ہوا، اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں، مراۃ الصفات اکبر کی ستایش میں لکھی گئی، اس میں کہتا ہے۔

تاج دہِ تارک روئین تنان　　سرشکن گبر قوی گردنان

شاہ فلک مسند خورشید رخش　　ملک ستانندہ و اقلیم بخش

گر بکشد تیغ جہان سوز را　　قطع کند سلک شب و روز را

ور نخورد مہر مے از جام او　　تیغ شود موے بر اندام او

سوے فلک گر فگند چشم کین　　آب شود چرخ در وود زمین

رائے وی از عقل جوان پیر تر　　بخت وی از صبح جہانگیر تر

ابر حیا کانِ کرم بحر جود　　تازہ گل گلشن چرخ کبود

مولانا شبلی نے شعر العجم حصہ سوم (ص۱۱) میں غزالی کی مثنوی نقش بدیع کے حسب ذیل اشعار کی داد دی ہے۔

خاک دل آن روز کہ می بیختند　　شبنمے از عشق برو ریختند

دل کہ بہ آن رشحہ غم اندود شد　　بود کبابے کہ نمک سود شد

بے اثر مہر چہ آب و چہ گل　　بے نمک عشق چہ سنگ و چہ دل

ذوق جنون از سر دیوانہ پرس　　لذت سوز از دل پروانہ پرس

غزالی کے بعد **ابو الفیض فیضی** ملک الشعراء ہوا، جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں، فیضی کی خوش بیانی، جدت طبع اور فلسفیانہ خیالات پر مولانا شبلی مرحوم کا ایک بے مثل تبصرہ شعر العجم حصہ سوم میں ملے گا، اس تبصرہ کی موجودگی میں فیضی کی شاعری پر مزید

روشنی ڈالنے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل ہے، پھر بھی ہم یہاں پر فیضی کے کچھ مدحیہ اشعار نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتے، جس سے اس کی شاعری کی شوکت و عظمت کے ساتھ ساتھ اکبر کی ذات سے اس کی محبت و شیفتگی کا بھی اندازہ ہو گا،

شاہنشاہا! خسرو پژوہا! — دریا گہرا! فلک شکوہا!
بزمے است، جہان بہ عیش پیوست — دور تو شراب و آسمان مست
امروز بہ این نوائے چو شہد — من بار بدم تو خسرو عہد
زین جامہ کہ کردہ ام فلک سائے — پیش تو ستادہ ام بیک پائے
این نامہ کہ عشق بر زبان برد — طغرائے ترا بہ آسمان برد
این چار ہزار گوہر ناب — کا نگیختہ ام بہ آتشین آب
بپذیر کہ آب گوہر تست — از بہر نثار افسر تست
پیمانۂ من اگر نشد پر — دریا کنمت نثار نہ دُر
گر عشق چنیں بسوزدم پاک — مہتاب بردن تراوم از خاک
بگداختہ آبگینۂ دل — آئینۂ دہم بدست محفل
آنم کہ بہ سحر کاری ژرف — از شعلہ تراشش کردہ ام حرف
بانگ قلمم درین شب تار — بس معنی خفتہ کرد بیدار
صبح بہ فیض بادشاہی — من بودم و باد صبح گاہی

مثنوی نل دمن لکھتے وقت اکبر کی شان میں کہتا ہے:-

اے پایۂ فزائے ہفت اورنگ — میزان عدالتت گران سنگ
فیض تو بہ روزگار مفتوح — چون بادہ بچشم و نغمہ با روح

صد باغ طرب بہ بزمگاہت | صد خم کدہ بادہ در نگاہت
اے از تو جہان سکون گرفتہ | با تیغ تو فتنہ خوں گرفتہ
رحمت کہ گل ظفر دماندہ | از خار ترا انگبین فشاندہ
ہر جا غرور کج کلاہے | سر کردۂ فتنۂ شد سیاہے
تیغ تو کلہ ربودہ سر ہم | این زہرہ تراست وین جگر ہم
آفاق بشام گاہ دیجور | از لہجۂ رائیست بردنور
آنرا کہ نشاط جاودانی ست | بیداری شب حیات آنی ست

فیضی کی علم دوستی بھی مشہور تھی، وہ اہل علم کے ساتھ غیر معمولی فیاضیان کرتا تھا، حیدر معمائی نے اس کی تفسیر کی تاریخ قُلْ ھُوَاللہُ سے نکالی، تو اس نے دس ہزار روپے انعام میں دیے، محمد جمال الدین عرفی شیرازی ہندوستان آیا، تو فیضی ہی کا مہمان ہوا، فیضی نے اس کی پوری قدردانی کی، اور اس کی ضروریات کی کفالت کرتا رہا، مگر وہ اپنی نخوت پرستی کے سبب فیضی سے الگ ہوکر اکبر کے دوسرے جلیل القدر امیر حکیم ابو الفتح گیلانی کے دربار سے وابستہ ہوگیا، اس کی وفات کے بعد عبد الرحیم خانخانان کے دربار کے ارباب کمال میں داخل ہوا، اپنے غرور، پندار اور خودستائی میں اکبر کے دربار سے بے نیاز رہنا چاہتا تھا، پھر بھی اکبر اس کی طرف ملتفت ہوا، اور عرفی نے اس کی شان میں کئی قصیدے کہے، پہلے قصیدہ میں اپنی جولانی طبع اس طرح دکھائی ہے:۔

اے دلِ معنی سرشت راز دان آفتاب | تا ابد بر خوان دولت میہمان آفتاب
بر کمال دولتت ہر کس کہ بیند بنگرد | از شراب تربیت رطل گران آفتاب
دولت جمشید ہمدوشی کند با دولتت | گر تواند سایہ بودن ہم عنان آفتاب

کاروان سالار شاہان آفتاب آمد ولے　　چون تو نامد یوسفی در کاروان آفتاب

رہ ہر سرکش رام شد در زیر ران دولتت　　چون سمند آسمان در زیر ران آفتاب

طوطی نطقم چو در مدحت شکر خائی کند　　آب کرم از ذوق گردد در دہان آفتاب

تا لوائے دولتت انگندہ اند از اوج عرش　　اہل معنی را نشد معلوم شان آفتاب

ہمچو شمعی کان برافروزند از شمع دگر　　از یکے نور است جان شاہ و جان آفتاب

فیض می تابد ز ذریت چون نتابد گر ازل　　گوہرت را پرورش دادہ است کان آفتاب

سجدہ گاہ ہفت اقلیم است مسندگاہ تو　　قبلۂ ہفت آسمان است آسمان آفتاب

ہر کجا آماج گاہی طلعتت آمادہ کرد　　می جہد تیر سعادت از کمان آفتاب

گر ہمائے آفتاب آرام گہ می داشتی　　جائے اکبر شاہ بودی آشیان آفتاب

وصف شاہ از ما کسی چون من کجا لائق شود　　ہر چہ کردم نقل کردم از زبان آفتاب

گرچہ پس از قرنے بود سعدین را باہم قران　　چون بود ہر صبح دم با شہ قران آفتاب

مدح خورشید و ثنای شہ کند عرفی مدام　　کز مریدان شہ است و عاشقان آفتاب

وقف دولت باد سر لایزال آسمان　　نور حشمت باد حسن جاودان آفتاب

بر سر شہ سایہ افگن چون شود بال ہما　　چون پر خفاش گردد سایہ بان آفتاب

گر بدان غایت کہ شہ بشناسدش باید شناخت　　از مسیحا ہم مجو نام و نشان آفتاب

آسمان داند کہ چون شاہ جہان ہرگز نبود　　قدردان آفتاب اندر زمان آفتاب[1]

اکبر کے دربار میں کسی کو خودستائی کی جرات اور ہمت نہیں ہو سکتی تھی، مگر خوددار عرفی ایک قصیدہ میں اکبر کو مخاطب کرکے کہتا ہے :-

---

[1] اس قصیدہ کے بعض اشعار اختصار کی خاطر حذف کر دیے گئے ہیں ؛

شہا! بہ بزم تو چون این قصیدہ برخوانم | کہ ملک نظم ز فیضش گرفتہ است نظام
سزد بجایزہ باجیب پر گہر گردوں | بدوشم افگند این جامہ ز مرد فام

اکبر ۹۹۷ھ میں کشمیر گیا، تو عرفی بھی ہم رکاب تھا، کشمیر پر اس نے ایک قصیدہ کہا جس میں اکبر کو مخاطب کرکے لکھتا ہے:-

حکم تو اتش آورد بکشمیر و گرنہ | کے از سر آن خاک بخاکِ دگر آید
می آید و می سوزد ازین رشک کہ کشمیر | چوں یافت کہ آید بکجا بر اثر آید

اکبر نے ایک موقع پر اس کو ایک گھوڑا بھی انعام میں دیا تھا، لیکن اس سے خوش ہونے کے بجائے اپنی رعونت میں اس نے گھوڑے کی ہجو لکھی، اکبری دور میں زور کلام، شوکت الفاظ جدت استعارات و تشبیہات، نازک خیالی، مضمون آفرینی، فلسفیانہ خیالات اور نئی نئی تمہید و ں کے لحاظ سے عرفی کا کوئی مقابل نہ تھا، اس نے اپنے شاعرانہ کمال پر کبر و نخوت کا جو اظہار کیا تو یہ بے جا نہ تھا، اور اس کی اس افتادِ طبع سے خود شاعری بھی معنوی حیثیت سے بلند مقام پر پہنچ رہی تھی،

محمد حسین **نظیری** نیشاپوری ہندوستان پہنچا تو عبد الرحیم خانخاناں کے دربار میں ملازم ہوا، اور اسی کی وساطت سے اکبر کے شاہانہ دربار میں رسائی حاصل کی، پہلی بار جب اکبری دربار میں پہنچا تو جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خسرو کی ولادت کا جشن تھا، نظیری نے اس موقع پر ایک قصیدہ پیش کیا جس سے اکبر کی توجہ اس کی طرف ہوئی، لیکن حاسدوں نے اس کو تقرب حاصل کرنے نہیں دیا، پھر بھی اس نے اکبر کی مدح میں اور بھی قصیدے لکھے جو مقبول ہوئے، اسکی سخن دانی اور سخن گستری کی داد جہانگیر اور شہزادہ مراد کے دربار میں زیادہ دی گئی جیسا کہ آگے ذکر آئے گا،

الغرض اکابر شعراء کے علاوہ دربار کے بعض اور سخن سنجوں کا بھی اجمالی ذکر ضروری ہے تاکہ اکبر

نے ان کی جس طرح قدردانی، عزت افزائی اور سرپرستی کی اس کا اندازہ ہو جائے، کہیں کہیں ہم ان شعراء کے کلام کے نمونے بھی ناظرین کے تفنن طبع کے لیے پیش کرتے جائیں گے، ان سے اس دور کے شعر و شاعری کے عام رجحانات کا پتہ چلے گا۔

خواجہ حسین مروی ۔ حضرت شیخ رکن الدولہ سمنانیؒ کی اولاد میں سے تھے، معقولات کی تعلیم مولانا عصام الدین اور ملا حنفی سے پائی، حدیث میں خاتم العلماء والمحدثین شیخ ابن حجر کی شاگردی کا شرف حاصل کیا، ہمایوں ان کے علم و فضل کا قدردان تھا، اس لیے اس کے ندیم خاص بھی رہے، اپنی فصاحت، بلاغت، لطافت اور ظرافت کے لیے مشہور تھے، ان کی شاعری میں سلاست، صنایع اور بدایع کا پہلو غالب رہتا تھا، شہزادہ سلیم کی ولادت کے موقع پر ایک قصیدہ کہا جس کے پہلے مصرع سے اکبر کی تاریخ جلوس اور دوسرے سے سلیم کی تاریخ ولادت نکلتی تھی، قصیدہ کا مطلع یہ تھا:-

للہ الحمد از پے جاہ و جلال شہریار — گوہر مجد از محیط عدل آمد برکنار

اکبر نے اس قصیدہ پر دو لاکھ ٹنکے انعام دیے،[1] اکبر کی فرمایش پر سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ شروع کیا، مگر اس کی تکمیل نہ کر سکے، شیخ فیضی نے ان سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، کلام کا نمونہ یہ ہے:

گوئیم مگر ز اہل وفائیم نہ ایم — واندر صفت صدق و صفائیم نہ ایم
آراستہ ظاہریم و باطن نہ چنان — افسوس کہ آنچہ می نمائیم نہ ایم

ثنائی مشہدی، نام خواجہ حسین، باپ کا نام غیاث الدین علی تھا، ایران میں اپنے کلام کی رنگینی اور پرکاری کے لیے مشہور تھا، وہاں ایک مدت تک سلطان ابراہیم مرزا کی

[1] طبقات اکبری ج ۲ ص ۲۱۶۔

ثناخوانی کی، ہندوستان میں آنے سے پہلے یہاں اس کا کلام ہر مجلس میں تبرک کے طور پر پڑھا جاتا تھا، ہندوستان آیا تو اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی اور آخر عمر تک اس کے خسروانہ مراحم سے مستفید ہوتا رہا، تمام تذکرہ نگار اس کے شاعرانہ کمال کے معترف ہیں، میخانہ کا مولف اس کو "عندلیب گلستان نکتہ سرائی" کہتا ہے، اور اس کی شاعری کو رنگ و بو سے رنگین اور معطر بتاتا ہے منتخب التواریخ (صفحہ ۲۰۸) میں ہے:۔

شاعر طبیعت است، و در ہمہ اقسام سخن غیر از توحید و موعظت ونصائح حکیم تنگناہی طرفہ دارد"

خواجہ نظام الدین احمد طبقات اکبری میں لکھتا ہے:۔

دیوان شعر و کتاب مثنوی دارد، و اقسام شعر را خوب و استادانہ می گفت، و از شعرائے وقت امتیاز داشت" (جلد سوم ص ۴۸۹)،

میخانہ (صفحہ ۱۶۶) میں مثنوی کا نام سکندر نامہ مرقوم ہے، اس میں اور منتخب التواریخ جلد سوم میں ثنائی کا ایک ساقی نامہ بھی منقول ہے، خانخانان عبدالرحیم کی شان میں بڑے لمبے لمبے قصائد کہے تھے، جو مآثر رحیمی جلد سوم میں ملیں گے، قصیدہ گوئی کو اس کی شاعری سے بھی بڑی ترقی ہوئی، اس کی ایک رباعی ملاحظہ ہو،

ترک ستمم چو کلہ گوشہ یغما شکند | نقد دلہا پر داز طرۂ و دریا شکند
ہر گز تندی خوی تو بخاطر نرسد | کہ نہ بر عارض دل رنگ تمنا شکند

اس کے کچھ اور کلام سے بھی لطف لیجیے، (آئین اکبری ص ۱۸۱)،

قاصد شوق دگر قطرہ زنان می آید | کہ بدل شوق کسے از پئے جان می آید
شرط عشق ست کہ ہم باز بدل بسپارند | سخن دوست کہ از دل بزبان می آید

درحوصلۂ نہ فلک از عشق نگنجید   ہر ذرہ کہ از خاک ثنائی بہوا رفت

میلی ہروی - مولانا شبلیؒ شعر العجم حصہ پنجم (صـ۶۶) میں عرفات اوحدی کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ قزلباشی امرا میں سے تھا، نہایت خوش رو اور خوش مزاج تھا، مدت تک مشہد اقدس میں سلطان ابراہیم مرزا کے دربار میں رہا، پھر ہندوستان آیا، یہاں حسین ثنائی، غزالی، وحشی وغیرہ سے معرکے رہے، مشہور ہے کہ اکبر کے دربار میں غزالی سے مناظرہ ہوا، غزالی نے حکمت عملی سے اس کو مغلوب کیا، اس کا اس کو اسقدر صدمہ ہوا کہ اسی وقت تپ چڑھ آئی، اور بالآخر بیمار رہ کر مر گیا، مگر منتخب التواریخ حصہ سوم (صـ۳۲۹) میں میلی ہروی کا ذکر ان الفاظ میں ہے،

"مرزا قلی نام، صاحب دیوان اور صاحب طرز ہے، اس کا سلیقہ شاعری ایسا تھا کہ اگر وہ اب تک زندہ رہتا تو بہت سے تمام شعراء کے دل میں شعر گوئی کا سودا سرد پڑ جاتا، اس کے زمانہ سے اس وقت تک کے شعرا میں سے اس کا کوئی مدمقابل نہ تھا، برسوں نورنگ خان کی خدمت میں رہا، اور اس کی مدح میں بڑے بڑے قصائد کہے، کہتے ہیں کہ بدگمانی کی بنا پر نورنگ خان کے حکم سے اس کے پیالہ میں کوئی ایسی چیز ڈال دی گئی کہ اس دنیا سے چل بسا، اس کی وفات مالوہ میں ہوئی،

طبقات اکبری جلد سوم (صـ۴۹۶) میں ہے:-

"مرزا قلی میلی نورنگ خاں کی خدمت میں برسوں رہا، نورنگ خان اس عالی شان دودمان (یعنی خاندان تیموری) کے امراء میں سے ہے، مرزا قلی غزل اور قصیدہ کا ایک دیوان رکھتا ہے"

آئین اکبری اور منتخب التواریخ میں میلی قلی کے بہت سے اشعار درج ہیں، جن میں سے

کچھ یہ ہیں :-

دانستہ ام کہ مہر تو با جان نمی رود | کز خاک کشتگان گذری سرگران ہنوز
نہ آشنا و نہ بیگانہ نمی دانم | کہ اختلاط چنین را کسی چہ نام کند
بیقرار است دل اندر بدن کشتۂ عشق | دیگر از یار ندانم چہ تمنا دارد
امتحان نام نہد دل ستمی کز تو کشد | خویش را چند باین حیلہ شکیبا دارد
میرم و بر زندگانم رحم می آید کہ تو | خوبان بے دادہا داری کہ با ما کردۂ

نوری۔ ملا نور الدین محمد ترخان نوری سفیدون (توابع سرہند) کے رہنے والے تھے، ہمایوں کے سلسلہ میں ان کا ذکر آچکا ہے، ہندسہ، ریاضی، نجوم و حکمت میں ان کا علم مشہور تھا، جود و سخا اور بذلہ سنجی میں ضرب المثل تھے۔ اکبر نے ان کی عزت و قدردانی باپ ہی کی طرح کی، اور ان کو خان کا بھی خطاب عطا کیا، چنانچہ اس خطاب پر اظہار تشکر کے ساتھ لطیف پیرایہ میں شکوہ بھی کرتے ہیں۔

زروے مکرمت وز راہ احسان | بہ ترخان داد خانی شاہ عادل
ازین خانی ہمین نا یست بروی | ازین نام شگرف او را چہ حاصل
ز ترخانی ہم او را شکوہ ہست | بہ نزد خسرو دانائے کامل
کہ غیر از خان خشکی می نماند | ز ترخانی تری گردد چو زایل

مگر بعض سیاسی اسباب کی بنا پر کچھ دنوں معتوب بھی رہے، آخر عمر میں ہمایوں کے مقبرہ کی تولیت ان کے سپرد تھی، شاعر بھی تھے اور اپنا ایک دیوان بھی ترتیب دیا تھا، یہ شعر انہی کا ہے :-

دل تنگ دور از آن لب خندان نشستہ ام | مانند غنچہ سر بگریبان نشستہ ام

توسنی ۔ نام منوہر تھا، سانبر کے راجہ لون کرن کا لڑکا تھا، اکبر نے اس کو مرزا منوہر کا خطاب دیا تھا، مگر وہ اپنے کو محمد منوہر لکھتا تھا، اس کی شاعری میں متانت و سنجیدگی تھی، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

شیخ مستغنی بدین و برہمن مغرور کفر مست حسن دوست را با کفر و ایمان کار نیست

تشبیہی کاشی ۔ کئی بار وطن سے ہندوستان آیا، اور ابوالفضل کے توسل سے اکبر کے دربار میں حاضر ہوا، اور قصیدہ بھی پیش کیا، ملا بدایونی کی رائے کے مطابق ملحد تھا۔

تقی الدین ششتری ۔ علوم عقلیات و نقلیات میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، اکبر کے حکم سے شاہنامہ کو منثور کرنے کی کوشش کی، مگر یہ سعی لاحاصل تھی اسی لیے ملا بدایونی اس قسم کی کوشش کے بارے میں لکھتے ہیں "قماش ابریشم را پلاس بدل میکند، و ریسمان را می سازد" یعنی مخمل کو ٹاٹ بنا رہا ہے، اور سوت کو روئی، اس کی سخن سنجی کا نمونہ یہ ہے:۔

گر دست ندہدم کہ برویت نظر کنم باری دہان بیا و لبت پر شکر کنم
بآنکہ ہمچو سبزہ بجا کم نشاندہی دست و دلی کجاست کہ خاکے بسر کنم

ثنائی خان ہروی اکبر کے قدیم درباری امرا میں سے تھا، دین الٰہی کی تشکیل میں معاون ہوا، اس کی حمایت میں کچھ رسالے بھی لکھے، شعر گوئی سے بھی کچھ ذوق رکھتا تھا، مگر آخر عمر میں اس سے توبہ کر لی تھی۔ ذرہ و خورشید کے عنوان سے ایک مثنوی بھی لکھی تھی،

جدائی سید علی نام، اکبر کے دربار کا مصور تھا، اکبر کے حکم سے قصۂ امیر حمزہ کی ۱۶ جلدوں کو مصور کیا، اور نادر الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا، ہمایوں بھی اس کا قدردان تھا، ہمایوں شاہی بھی کہلاتا تھا، (طبقات اکبری حصہ سوم صفحہ ۵۰۳)، ملا بدایونی اس کو ہندوستان کا مانی لکھتے ہیں، شاعر بھی تھا، [illegible] ایک دیوان بھی ترتیب دیا تھا کچھ اشعار یہ ہیں:۔

صبح دم خار دم از ہمدمی گل می زد ناخنی در دل صد پارہ بلبل می زد

حسن تبان کعبہ ایست عشق بیابان او سرزنش ناکسان خار مغیلان او

نیم بسمل صیدم وافتادہ دور از کوی دوست میروم افتان و خیزان تا بہ بینم روی دوست

جعفر بیگ قزوینی ۔ عمدہ بخشی پر مامور تھا، اکبر نے آصف خان کے خطاب سے عزت بخشی، اسکی بذلہ سنجی مشہور تھی،

رسید و مضطربم کرد و آن قدر ننشست کہ آشنا سے دل خود کنم تسلی را

شہر گنجایش غمہاے دل ما چو نداشت آفریدند براے دل ما صحرا را

حیاتی گیلانی ۔ عراق و خراسان میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد ہندوستان آیا تو پہلے حکیم ابوالفتح گیلانی کے دربار سے منسلک ہوا، اور اسی کی وساطت سے اکبر کے دربار میں پہنچا، اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی، منصب علوفہ اور جاگیر عطا کی، مآثر رحیمی کے مصنف کا بیان ہے کہ

"در چندان قرب و منزلت او را در ملازمت آن بادشاہ بہم رسید کہ مزیدی بران متصور نہ بود"

عبدالرحیم خانخانان دکن کی مہم پر روانہ ہوا تو اس کے ساتھ حیاتی بھی گیا، خانخانان نے اس کی بڑی قدردانی کی، اور اسی کی سفارش پر حیاتی کو اکبر نے منصب ہزاری بخشا، خانخانان بزم اور رزم دونوں میں ہمکو ساتھ رکھتا تھا، حیاتی نے جذبۂ تشکر میں اس کی شان میں لمبے لمبے قصیدے کہے، حیاتی جہانگیر کے دربار سے بھی وابستہ رہا، مآثر رحیمی کا مولف اس کی علمی اور شاعرانہ صلاحیت پھر ذاتی اوصاف کا بہت مداح ہے، لکھتا ہے،

ہر لفظی از منظومانش چون زمان صباح متضمن طلوع آفتاب معانی ۔ و ہر حرفی از منثور آتش، چو دم عیسوی متکفل حیات باقی ۔ رشحات آبدارش از ہمعنان رشک قطرات سحاب،

ونظم کلامش در پاکیزگی غیرتِ گوہر سیراب، وجامع فنون کمالات وحیثیات کسبی و وہبی است وآداب نیکو ذاتی وخوش صحبتی وشگفتہ روئی وقاعدہ دانی دستور العمل ارباب این فن است وجود شریفش در ہر مکان وزمان باعث تفریح قلب وسرور اکابر واعیان، وجمیعت و خوشحالی ومستعدان است۔" (جلد سوم ص۳۹)۔

ملا بدایونی کی مدح وتعریف میں یہ غلو نہیں، وہ رقمطراز ہیں،

"از یاران دردمند ودر اقسام شعر متتبّع، صاحب دیوان است، واورا باسخنان اکثر سریست اگرچہ از مادہ علمی عاریست، اما جد وجہد وفہمی درست دارد ومنصف است۔"

کلام کا نمونہ یہ ہے،

بہ ہر سخن کہ کنی خویش را نگہبان باش	زگفتنی کہ دلی نشگفد پشیمان باش
چہ بال مرغ کہ گر شغل روزگار این است	زمور ہم قدمے وام کن گریزان باش
این سبزہ واین صحرا بوی زجنون دارد	دیوانگی ومستی امروز شگون دارد

خنجر بیگ۔ اکبر کے دربار کے چغتائی امراء میں سے تھا، سپہگری، موسیقی، خوش خلقی، ہمگوئی اور علم نجوم وہیئت میں یگانۂ روزگار سمجھا جاتا تھا، تین ہزار ابیات کی ایک مثنوی لکھی، جس میں اکبر کی مدح کرکے اپنے ذاتی فضائل بیان کئے ہیں، ملا بدایونی کا بیان ہے کہ اس مثنوی کے صلہ میں اکبر نے اس کو بہت سی نوازشوں سے سرفراز کیا، مثنوی کے کچھ اشعار منتخب التواریخ جلد ۳ (ص ۲۲۴ – ۲۲۶) میں ملیں گے، اس نے اپنا ایک دیوان بھی ترتیب دیا تھا،

میر دوری۔ نام سلطان بایزید تھا، بدایونی کا بیان ہے کہ اس نے خط نستعلیق لکھنے میں ایسی مہارت پیدا کی تھی کہ ہندوستان میں اس کا کوئی مدمقابل نہ تھا، اسی لیے اکبر نے کاتب الملک کا خطاب عطا کرکے نوازا، شعر گوئی سے بھی دلچسپی رکھتا تھا،

گہ در درون جانے گہ در دل حزینی   از شوخی کہ داری یکجا نمی نشینی

میر حیدر رفیعی یہ کاشان سے گجرات آیا، اور وہاں سے لاہور پہنچکر شاہی ملازمت میں داخل ہوا، ملا بدایونی اور ابوالفضل کا بیان ہے کہ معما اور تاریخ گوئی میں عدیم المثال تھا، آخر عمر میں وطن واپس چلا گیا، [illegible] دیوان چھوڑا، [illegible] کی ایک رباعی یہ ہے :-

زاہد نکند گنہ کہ قہاری تو   ما غرق گنا ہیم کہ غفاری تو

او قہاریت خواند و ما غفارت   یارب بکدام نام خوش داری تو

روغنی - اپنی [illegible] غزل گوئی کے لیے مشہور تھا، اس کے دیوان میں تین ہزار اشعار تھے،

زین خان کوکہ - اکبر کا رضاعی بھائی، اور اس کے دربار کا [illegible] ہزاری (طبقات اکبری کے [illegible] پنجہزاری) امیر اور شہزادہ سلیم کا خسر تھا، موسیقی خصوصاً ہندی راگ کا بڑا شیدائی تھا، کبھی کبھی اشعار بھی موزون کرلیتا تھا، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو،

آرام من نمی دہد این چرخ کج خرام   تا رشتہ مراد بسوزن در آورم

دفائی اصفہانی اسی کی سرپرستی میں رہا،

سرمدی اصفہانی - نام محمد شریف، کچھ دنوں چوکی نویس رہا، پھر شریف آملی کے ساتھ بنگالہ میں کسی خدمت پر مامور کیا گیا، ملا بدایونی کا بیان ہے کہ پہلے فیضی تخلص کرتا تھا، فیضی نے اکبر سے اس کی شکایت کی، تو پھر سرمدی تخلص رکھا، آئین اکبری میں ابوالفضل نے اس کے بہت سے منتخب اشعار لکھے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں۔

زگرم خوئی عصیان چہا بخود گریم   بہ پشت گرمی رحمت چہ جرمہا داریم

بہ گلشنے من وبلبل شوق افشاندیم   کہ رشک از آمدن و رفتن صبا داریم

بغیر وصل ہزار آرزو ہست عاشق را
ہنوز ما بتہ دامے بخت کارہا داریم

سیدی۔ نام سید شاہ، گرم سیر کے سادات میں سے تھا، شیخ اسلام چشتی سے شرف بیعت حاصل کیا، کچھ دنوں دربار شاہی سے بھی منسلک رہا، آخر عمر میں قلیچ محمد خان کابل کے پاس جاکر ملازم ہوا، خوش طبع اور خوشگو شاعر تھا۔

اول سرگرمی عشقت و دل در اضطراب
ہمچو طفلی کو تپد ہنگام بیداری ز خواب

ملا شیری۔ پنجاب کے شیخ زادگان میں سے تھے، ابوالفضل کا بیان ہے کہ شعرو شاعری میں اکبر ہی کی توجہ سے ان کو درک حاصل ہوا،

"بنظر گیتی خداوند دریخن بردے او کشودند"

مآثر رحیمی کے مؤلف کا بیان ہے:۔

"بکمال حیثیات آراستہ و پیراستہ است، و طبعش خالی از متانت و پختگی نیست، و اشعار او در ہندوستان مشہور است۔" (ص ۱۱۱)

ملا بدایونی ملا شیری کے شاعرانہ کمالات کے بہت مداح ہیں، اور لکھتے ہیں کہ ان کو شعر کہنے پر بڑی قدرت حاصل تھی، زمانہ کے آلام و مصائب کی تصویر ان سے بہتر کسی اور شاعر نے نہیں کھینچی، ایک رات میں تیس تیس غزل کہنے کا دعویٰ کرتے تھے، قصیدہ اور قطعہ گوئی میں اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے، اور ان کی فصاحت کے مقابلہ میں دوسروں کی فصاحت ماند پڑ گئی تھی۔ (جلد سوم ص ۲۴۹)، طبقات اکبری (جلد دوم ص ۴۹۱) میں ہے کہ آفتاب پر ایک مثنوی شمع جہاں افروز کے نام سے لکھی تھی جس میں ایک ہزار اشعار تھے، پہلے ذکر آچکا ہے کہ اکبر نے مہابھارت اور ہربنس کے ترجمے کے لیے ان کو مامور کیا تھا، ان کے اشعار کے بہت سے نمونے منتخب التواریخ جلد سوم اور مآثر رحیمی جلد سوم میں ملیں گے، ایک قصیدہ میں کہتے ہیں:۔

اے جہان در قبضۂ حکمت بضرب تیغ و تیر　　　تا جدار تخت و بخت از فیل و اسپ آفاق گیر

تاج و تخت در تیغ و تیرت مہر و مہ برق و شہاب　　　در شمار فیل و اسپت گشتہ عاجز صد دبیر

اکبر کی شان میں ایک قصیدہ جواب و سوال کے طرز پر کہا تھا، جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:-

گفتم اے دل ز چہ اوضاع جہان گشت بدل　　　گفت خاموش کہ در مغز فلک رفتہ خلل

گفتم از چاہ امید آب تمنا نرسد　　　گفت کوتہ بود از ... رسن طول امل

گفتم از بخت بہ تفصیل شکایت دارم　　　گفت باید بہ شہنشاہ بگوے مجمل

گفتمش اکبر جم قدر سلیمان دانش　　　گفت خاقان بلند اختر خورشید محل

گفتم آن ذات نبی را بہ تعظیم ثانی　　　گفت آن خلق خدا را بہ تفضل اول

گفتم اصل و نسبش لازم تاج است و سریر　　　گفت لطف و کرمش حامی ملکت و ملل

باباطالب اصفہانی۔ طبیعت میں درویشی تھی، اس لیے پہلے قلندر رہے، پھر اکبر کے دربار سے منسلک ہو گئے، اکبر نے تبت ایلچی بنا کر بھیجا، واپس ہوئے تو وہاں کے حالات ایک رسالہ میں قلمبند کیے، جس کو شیخ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں شامل کر لیا، ادب و دانش کے ساتھ شعر گوئی میں بھی بڑا سلیقہ رکھتے تھے، جہانگیر کے زمانہ میں گجرات کے صدر مقرر ہوئے، انکی ایک رباعی یہ ہے۔

زہرم بفراق خور چشانی کہ چہ شد　　　خون ریزی و آستین فشانی کہ چہ شد

اے غافل از انکہ تیغ ہجر تو چہ کرد　　　خاکم بغشار تا بدانی کہ چہ شد

غنایی۔ سید محمد نجفی الہ آباد میں کسی عہدہ پر تھا، اپنی ہجو گوئی، بے باکی اور درشتی طبع کی وجہ سے شاہی دربار سے معتوب رہا، مگر ارباب فن اس کی عربی اور فارسی شاعری کے مداح تھے،

میر عزیز اللہ قزوینی۔ طبقات اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلص عزیزی تھا، احساب و سیاق کا ماہر تھا، سنبھل کے ضبط و نسق کے لیے مامور ہوا[۱]، جہاں بعض امور کی بنا پر شاہی التفات

[۱] طبقات اکبری ج ۲ ص ۵۱۰ میں ہے، "تنہا دیوان عدالت بود"

سے محروم ہوگیا، ایک دیوان اور ان منظوم رسالوں شہر آشوب، گل و مل، روح القناعت، رسالۂ منظوم ربل صحیفۃ العشاق کا مولف تھا، (طبقات اکبری جلد سوم ص۴۸۸)، کلام کا نمونہ یہ ہے:-

نیست ہر بسوئے مژگان دیدۂ نمناک را   بر کنار افگند موج اشک من خاشاک را

تن سیمین نہ شد او را از خاک پیرہن پیدا   سمن در باغ خوبی شد ز برگ یاسمن پیدا

چنیں کافتادہ در راہ غم و محنت چو خاشاکم   نسیم لطف و احسانت مگر بردارد از خاکم

مرزا عزیز کوکہ۔ آتکہ خان کا لڑکا اور اکبر کا رضاعی بھائی تھا، اکبر اس کو بہت محبوب رکھتا تھا، اس کے مختلف سیاسی اور حربی کارناموں کی وجہ سے اس کو پنجہزاری اور **خان اعظم** کا خطاب عطا کیا، جب کبھی اس سے اختلاف ہوتا تو اکبر اس سے درگزر کرتا، اور کہتا کہ میرے اور عزیز کے درمیان دودھ کی ایک نہر بہتی ہے، اس کے علم و ہنر سے تمام معاصرین متاثر تھے، ملا بدایونی لکھتے ہیں:-

"بہ انواع و فضائل و ہنر موصوف است و بفہم عالی و ادراک بلند او کسے دیگر انذا مرا نشان نمی دہند"

طبقات اکبری جلد دوم (ص۴۲۵) میں ہے،

"بجودت فہم و جدت طبع و وقوف در علم تاریخ عدیل ندارد"

تزک جہانگیری میں جہانگیر رقمطراز ہے،

"در علم سیر و فن تاریخ استحضار تمام داشت و در تاریخ و تقریب بے نظیر بود، و در دعا نویسی ید طولیٰ داشت، و در لطیفہ گوئی بے مثل بود و شعر ہموار می گفت"

یہ لکھ کر جہانگیر نے اس کی حسب ذیل رباعی پسند کی ہے،

عشق آمد از جنون بر و مندم کرد   وا رستہ ز صحبت خرد مندم کرد

ازادو زہد و دین و دانشش گشتم — تا سلسلۂ زلف کسے بندم کرد

مولانا شبلی نے شعر العجم حصہ سوم (ص۱) میں اس کی نکتہ سنجی کی داد دی ہے اور اس کے حسب ذیل مطلع کو پسند کیا ہے۔

گشت بیمار دل از رنج و غم تنہائی — اے طبیب دل بیمار چہ می فرمائی

خانخانان عبد الرحیم اور حکیم ابو الفتح گیلانی کے بعد اس کے دربار کی علمی محفل آرائی مشہور تھی، مقیمی سبزواری، جعفر ہروی، اور مدامی بدخشی خان اعظم[1] ہی کی سرکار سے وابستہ تھے، حیدری نے بھی اس کے خوان کرم کی زلہ ربائی کی، اس کو نقاشی میں بھی بڑی مہارت تھی، آگرہ میں ایک باغ جہاں آرا کے نام سے تیار کیا، اور وہاں نقش و نگار کے ساتھ اپنی حسب ذیل رباعی لکھوائی۔

یارب بصفائے دل ارباب تمیز — کان نزد تو ہست خوب تر از ہمہ چیز

چون گشت بتوفیق تو این خانہ تمام — از راہ کرم فرست مہمان عزیز[2]

عنایت اللہ شیرازی۔ شاہی کتب خانہ کا کتاب دار تھا، اس کی خوشنویسی پر اکبر نے اس کو مکتوب خان خطاب سے سرفراز کیا، اپنی خوش طبعی کی بنا پر کبھی کبھی طبع آزمائی کر لیتا تھا، اس کی ایک رباعی یہ ہے:-

تا کاکل و زلف نیکوان خم بخم است — تا شیوۂ و رفتار بتان چم بچم است

تا ناوک غمزہ در کمان ستم است — مرگ من و زندگی من دم بدم است

غباری۔ قاسم علی نام، غباری تخلص، بقال تھا، اکبر نے اس کو اپنا نقیب بنایا، اور خان کا خطاب عطا کیا۔

---

[1] خان اعظم کے حالات کی تفصیل کے لیے دیکھو [illegible] الامرا جلد اول ص ۶۷۳ - ۷۰۰ و [illegible]

[2] ریاض الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی۔

نشانی، نام مولانا علی احمد، مولانا حسین نقشی دہلوی مہرکن کے فرزند تھے، ہیئت و طبیعیات کے عالم تھے، خطاطی اور مہرکنی کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی، شہزادہ سلیم کے استاد بھی رہے، دربار میں بڑا عروج و رسوخ حاصل کیا، اور گو یک صدی کے منصبدار تھے، مگر ملا بدایونی کا بیان ہے کہ کسی امیر سے کمتر نہ تھے، اکبر نے گجرات تسخیر کر کے سکہ جاری کیا تو انھوں نے شاہی سکہ بنایا اور یہ تاریخ گذرانی :-

خسروا سکۂ گجرات بنام تو زدند ملک را سایۂ عدل تو تبارک بادا

ای خوش آن دم کہ چو تاریخ وی از من پرسی گویمت، سکۂ گجرات مبارک بادا

ملا بدایونی ان کے علم و فضل کے بہت ہی معترف تھے، اسی لیے ان کی مثنویات، قصائد، اور رقعات کے نمونے منتخب التواریخ میں نقل کیے ہیں، (دیکھو جلد سوم ص ۳۴۹-۳۶۰)،

نامی۔ میر محمد معصوم خان نامی، بھکر وطن، آبا و اجداد ترمذ سے آئے، محمد معصوم خان طبقات اکبری کے مولف خواجہ نظام الدین احمد اور گجرات کے صوبہ دار شہاب خان کی وساطت سے شاہی دربار میں پہنچا، اکبر اس کو بہت عزیز رکھنے لگا، رفتہ رفتہ وہ ہزاری منصبدار بھی ہوا، ایران کا سفیر بنا کر بھیجا گیا، وہاں سے تبریز گیا، جہاں حکیم شفائی، محمد رضا فکری اور تقی اوحدی کی صحبت میں شعر و شاعری کا شغل جاری رکھا، وہاں سے واپس ہوا تو جہانگیر نے بھکر میں امین کے عہدہ پر مامور کیا، اپنی دیانت، امانت، شجاعت، سخاوت، زہد اور تقویٰ کی وجہ سے بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، علمی حیثیت سے وہ کثیر الاشتغال تھا، طب میں ایک رسالہ مفردات معصومی قلمبند کیا، ایک ضخیم تاریخ سندھ لکھی جو تاریخ معصومی کے نام سے مشہور رہی، آج بھی یہ تاریخ اپنے معلومات کے لحاظ سے مفید سمجھی جاتی ہے، میر محمد معصوم نامی کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور ہمیشہ ایک سنگ تراش ساتھ رکھتا تھا، جو جا بجا اس کے اشعار پتھروں پر کندہ کر دیتا تھا، دیوان کے علاوہ خمسہ کے طرز پر پانچ مثنویاں، معدن الافکار، حسن و ناز، پری صورت، نادرہ اور لکھیں، ایک طویل قصیدہ

منقبت اور بہت سی رباعیاں ملا بدایونی نے منتخب التواریخ جلد سوم (ص ۲۶۷۔۲۶۸) میں نقل کی ہیں۔ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں،

یک حصۂ عمر من بنادانی رفت　　یک حصہ ازان چنانکہ می دانی رفت
یک حصہ بہیودہ بہ بیکار گذشت　　یک حصہ بافسوس و پشیمانی رفت

تا کے دل ازاین و آن پراز کینہ کنی　　تا چند بزر سینہ چو گنجینہ کنی
کار این بنود کہ تیرہ سازی دل را　　آن کار بود کہ دل چو آئینہ کنی

غزنوی۔ میر محمد نام، خان کلان خطاب، اکبر کے دربار کا جلیل القدر امیر پنجہزاری منصبدار تھا، اس کی مجلس میں شعر و شاعری کا شغل برابر جاری رہتا تھا، سنبھل کی حکومت کے زمانہ میں ایک بار شیخ سعدی کا یہ مطلع اس کے سامنے پڑھا گیا،

دلے کہ عاشق صابر بود مگر سنگ است　　ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

غزنوی نے فوراً کہا۔

دمے کہ چہرۂ ساقی زبادہ گلرنگ است　　بنوش بادہ بر آواز نے کہ دل تنگ است

اسی کے دربار کے ایک شاعر جمال خان بدایونی نے بھی ایک مطلع کہا

ترا رخ از مے عشرت مدام گل رنگ است　　مرا بفکر دہانت چو غنچہ دل تنگ است

فارسی اور ترکی کا ایک دیوان بھی چھوڑا، مآثر الامرا جلد سوم (ص ۲۱۶) میں اس کے حسب ذیل دو شعر منقول ہیں،

در جوانی حاصل عمرم بنادانی گذشت　　انچہ باقی بود آن ہم در پشیمانی گذشت
کس آب بجز مردم چشم نہ دہد　　جز آہ سحر ہم نفسے نیست مرا

ہمدمی۔ نام مرزا ظہیر بیگ، اکامران کے کوکہ ہمدم بیگ کا لڑکا تھا، مرزا برخوردار بھی

کہلاتا تھا، ہمدمی تخلص اور خان عالم خطاب تھا، مرزا کامراں ہمایوں سے شکست کھاکر حجاز کے
سفر پر روانہ ہو تو ہمدمی ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پہلے یہ بیت پڑھی۔

کلاہ گوشہ درویش بر فلک ساید — کہ سایہ ہمچو تو شاہی فگند بر سر او

اور اسی کے بعد یہ شعر بھی زبان پر لایا،

بر جانم از تو ہر چہ رسد جائے منت است — گر ناوک جفاست وگر خنجر ستم

یہ سنکر ہمایوں بہت متاثر ہوا اور اس کو بڑی نوازشوں کے ساتھ اپنے ساتھ اپنے
دربار میں رکھا، اکبر نے بھی شاہانہ لطف وکرم سے نوازا، اور سہ ہزاری منصب اور خان عالم
کا خطاب عنایت کیا، اکبر کے ساتھ حصار پٹنہ کی تسخیر میں بڑی جانبازی دکھائی، عبدالرحیم خانخاناں
کے ساتھ بنگالہ کی مہم میں بھی ساتھ رہا، اور ۹۸۲ھ میں اوڑیسہ کی لشکر کشی کے سلسلہ میں مارا گیا[1]
شعر وشاعری سے بھی دلچسپی رکھتا تھا، اکبر کو آصفی کا یہ مطلع پسند تھا،

قاتل من چشم می بندد دم بسمل مرا — تا بماند حسرت دیدار او در دل مرا

اکبر نے ہمدمی کو اسی مطلع پر ایک مطلع کہنے کی فرمایش کی تو اس نے کہا.

آمد و بگذشت از دل تیر آن قاتل مرا — ماند تا روز قیامت داغ او در دل مرا

فیضی کا بھی ایک مطلع اسی قافیہ وردیف میں ہے۔

پا بہ رہ بگذار اے قاتل دم بسمل مرا — تا باین تقریب پابوسی شود حاصل مرا

ہمدمی کا ایک قطعہ ہے۔

اے کہ کردی بہرزہ ریش سفید — یک بیک می کنی ز بہر نمود
بزبان دادہ جوانی را — ریش کندن کنون ندارد سود

[1] مآثر الامراء، ج ا ص ۲۵ - ۶۲۳، ومنتخب التواریخ ج ۲ ص ۸۶ - ۳۸۵،

اشکی - میر اشکی قمی ابن سید علی محتسب، ہندوستان آیا، تو اکبر کے دربار میں ملازم ہوا، ریاض الشعراء کے مولف کا بیان ہے کہ یہاں غزالی مشہدی وغیرہ سے اس کے شاعرانہ معرکے ہوتے تھے، وفات سے کچھ دنوں پہلے اپنا دیوان نادر الملک جدائی کو دیا، جس نے اسکے کچھ اشعار اپنی طرف منسوب کر لیے، ریاض الشعراء میں ہے کہ غزالی نے اس پر ایک ہجو بھی کہی تھی، ملا بدایونی نے اس کے کلام کے کچھ نمونے دیے ہیں۔

از بسکہ سنگ بر سرزد بے تو سینہ چاکی — آں سنگ در کف او گردیدہ مشت خاکی

بس سنگ از غمت بر سر من دل سنگ خواہم زد — اگر دستم رود دانہ کار سر بر سنگ خواہم زد

اگر خواہم کہ در راہ تو از سنگ بلا افتم — زہر مو بر من آید سنگ و نگذار دکہ یا افتم

موخر الذکر شعر لکھکر ملا بدایونی کہتے ہیں کہ "مضمون سنگ" پر اس سے بہتر شعر کہنا مشکل ہے۔

فکری خراسانی - نام سید محمد، اکبر کا قصیدہ خوان بھی رہا، رباعی کہنے میں شہرت حاصل کی، اس لیے میر رباعی کے نام سے مشہور ہوا، اس کے اشعار میں بلند افکار ہوتے تھے، اسکی ایک رباعی ہے۔

زان بت ہمہ غم نصیب ما خواہد بود — بیداد و ستم نصیب ما خواہد بود

تا عمر بود از آن قد و زلف و دہاں — پیوستہ الم نصیب ما خواہد بود

فیضی تربتی - اکبری دور کا بلند پایہ شاعر تسلیم کیا گیا ہے، ملک الشعراء ابو الفیض فیضی نے اس کے شاعرانہ کمالات کی بڑی تعریف کی ہے، اکبر کی شان میں فیضی تربتی نے متعدد قصائد کہے - ریاض الشعراء میں اس کی بہت سی رباعیاں منقول ہیں، ایک دو ہم بھی ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

لہ طبقات اکبری جلد سوم ص ۴۹۲

اے قبلۂ جان کعبۂ من کوئے تو باشد   محراب می سازم خم ابروئے تو باشد

گر جانب مسجد گذرم و ز طرف دیر   ہر جا کہ روم روئے دلم سوئے تو باشد

زاہد تو ز مستی منگر پستی ما   صرف رہ نیستی شدہ ہستی ما

ما مست محبتیم و تو مست غرور   فرق است ز مستی تو مستی ما

سید فسونی یزدی - محمود بیگ نام[1] ظاہری، معنوی اور علمی حیثیت سے یگانۂ روزگار سمجھا جاتا تھا، شعر و شاعری کے علاوہ فن سیاق، نجوم و ہیئت، حساب اور تاریخ سے بھی اسکو واقفیت تھی، ریاض الشعراء میں ہے کہ اکبر کے علاوہ جہانگیر اور شاہ جہان کے دربار سے بھی منسلک رہا، جہانگیر نے اس کو افضل خان کا خطاب بھی عطا کیا تھا، اس کے بعض اشعار یہ ہیں

خواب راحت شد ازان دیدہ کہ دیدن دانست   رفت آسایش ازان دل کہ طپیدن دانست

خبردار آن زمان خواہی شدن از سوز پنہانم   کہ آتش سر برون آوردہ باشد از گریبانم

فنائی ہروی - چغتائی نسل سے تھا، اکبر نے اس کو بھی خان کے خطاب سے نوازا تھا، طبقات اکبری (جلد سوم ص ۵۰۲) میں ہے کہ تمام عمر اکبر کی بارگاہ میں رہا، ملا بدایونی (جلد سوم ص ۲۶۹) رقمطراز ہیں کہ اس کا حسب ذیل مطلع ان کو اسقدر پسند آیا کہ اس کو پچاس سال تک یاد رکھا،

نہ گوئیم بہر تشریف خدمت خانۂ دارم   غریبم خاکسارم گوشۂ ویرانۂ دارم

فنائی کا ایک مطلع یہ بھی ہے

تا گل روی تو از بادۂ گلفام شگفت   بادۂ از عکس گل روئے تو در جام شگفت

فیروزہ کابلی - مرزا محمد حکیم کے یہاں تربیت پائی، آئین اکبری میں ہے کہ اکبر نے اس کو منصب دو ہزاری عطا کیا، موسیقی اور شاعری سے بھی ذوق رکھتا تھا، متقدمین اور متاخرین

---

[1] آئین اکبری میں ہے "از ناموران تکیبان، اختر پیکلہ بہ شہرت"

کے شعراء کی غزلوں پر غزلیں لکھنے کا بھی دعویدار تھا، ملا بدایونی (جلد سوم ص۲۱۰) لکھتے ہیں کہ اسکی علمی استعداد تو اچھی نہ تھی، مگر شعر فہمی کی صلاحیت اچھی رکھتا تھا، اور اس کی شاعری کے جو نمونے پیش کیے ہیں ان میں سے دو شعر یہ ہیں۔

غیر منظور نظر ساختۂ یعنی چہ   بندہ را از نظر انداختۂ یعنی چہ

کس ندیدم بدور تو باین حسن و جمال   قیمت حسن بر انداختۂ یعنی چہ

حیدری تبریزی - تین بار عراق سے ہندوستان آیا، پہلی بار قاسم خان نیشاپوری کے دربار سے وابستہ رہا، مگر ہندوستان اس کو پسند نہ آیا، اس لیے اس کی ہجو بھی لکھی، اور وطن واپس چلا گیا، دوسری بار ہندوستان آیا تو خان اعظم مرزا کوکہ کے [illegible] کرم کی خوشہ چینی کی، اس کی شان میں ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا

نزد اہل سخن چون کنم بیان سخن   اگر مدد نکند روح صاحبان سخن

خان اعظم نے اسکے صلہ میں دو ہزار روپے، خلعت اور گھوڑا عطا کیا، شمس الدین محمد اتکہ خان کے وسیلہ سے شاہی دربار میں بھی حاضر ہوا، ایک قصیدہ میں اکبر کے ہاتھی کی تعریف اس طرح کی

نبود پشت ہائے ریگ روان   فیلہائیش کہ در صف ہیجاست

کز پئے غرق کردن اعدا   ہر طرف موجہای بحر بلاست

ملا بدایونی (جلد سوم ص۲۱۸) رقمطراز ہیں کہ اکبر نے اس قصیدہ پر خلعت اور اسپ اور کچھ روپے عنایت کئے، مگر شاہی خزانہ سے ملنے میں دیر ہوئی، تو یہ قطعہ لکھکر اکبر کی خدمت میں پیش کیا،

مشکلے دارم شہا خواہم کنم پیش تو عرض   وانکہ زین مشکل مرا صد داغ حسرت بر دست

سیم وزر انعام کردی لیک از خازن مرا | ہم گرفتن مشکل وہم ناگرفتن مشکل است

خزانہ عامرہ (مولفہ آزاد بلگرامی) میں ہے کہ اکبر نے حیدری کو انعام حسب ذیل قصیدہ پر عطا کیا تھا، اور اس کے نہ ملنے پر مذکورہ بالا قطعہ لکھا۔

اما چو روزگار مددگار من نبود | زان شاخ گل بپای دلم خار غم خلید

نشنید شاہ عقدہ کشا مصرعی ز من | بکشود فصل از آرزو من از ین کلید

بودم ز آب دیدہ ترغرق بحر غم | کز عیب این ترانہ بگوش دلم رسید

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است وبس | در بند آن مباش کہ نشنید یا شنید

تیسری بار حیدری ہندوستان آیا تو خانخاناں کے دربار میں شغل سخن کو جاری رکھا، مگر پھر وطن کی طرف مراجعت کی، اور وہیں ۱۰۰۲ھ میں وفات پائی، اس کے دیوان میں چودہ ہزار اشعار تھے، ایک مثنوی لسان الغیب بھی لکھی، جس میں اپنے استاد لسانی کی مدح کی تھی،

(بدایونی جلد سوم ص ۲۱۸، ونیز انگریزی ترجمہ)

حلیمی۔ مرزا جانی بیگ ارغون حلیمی ٹھٹہ کا حاکم تھا، اپنی فراست و دانائی کے لیے مشہور تھا، اکبر نے اس کو سہ ہزاروپانصدی کا منصب عطا کیا، شعروشاعری میں حلیمی تخلص کرتا تھا، مآثر الامرا جلد سوم (ص ۳۱۰) میں اس کے یہ دو شعر مرقوم ہیں:

خوش آن وقتے کہ عشق غمخوارم بود | آہ شب و گریۂ سحر کارم بود

بد گردئ چرخ بین کہ بامن نگذاشت | کالائے غمی کہ زیب بازارم بود

میر معز تقضی سمنانی۔ فوجی عہدہ دار تھا، دکن کے اکثر علاقہ کو اس نے فتح کیا، آخر عمر میں شاہی دربار میں رہتا تھا، جہانگیر کے زمانہ میں وفات پائی، ریاض الشعرا اور مخزن الغرائب میں اس کا یہ شعر منقول ہے:

اے از رخ تو مارا صد عیش و کامرانی　　　در عیش و کامرانی صد سال زندہ مانی

اسد بیگ قزوینی، ہندوستان آیا تو اکبر کے وزیر اعظم ابو الفضل کے دربار میں سترہ سال تک ملازم رہا، اس لیے اسد شیخ ابو الفضلی کہلایا، ابو الفضل کے قتل کے بعد اکبر نے اس کو اپنے دربار میں داخل کر لیا، شہزادہ دانیال کی نسبت کے سلسلہ میں اکبر نے اس کو دائی بیجاپور کے پاس بھیجا، وہاں سے واپسی کے بعد اس کو شاہی حاجب بنایا گیا، منصب اور ستر ہزار روپیے کا وظیفہ بھی عطا کیا گیا، اکبر کی وفات سے پہلے دکن میں بعض خدمات کو انجام دینے کے لیے سفیر کی حیثیت سے مامور ہوا، مگر وہاں پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کو اکبر کی وفات کی خبر ملی، دارالسلطنت واپس آیا تو جہانگیر کے دربار میں اس کی پذیرائی نہ ہوئی، ابو الفضل کے قتل کے سلسلہ میں جہانگیر اس سے ناراض تھا، مگر رفتہ رفتہ یہ ناراضگی دور ہو گئی، اور مقبول بارگاہ ہوا تو جہانگیر نے اس کو پشیرو خاں کا خطاب عطا کیا، سخن سنجی و سخن فہمی کے ساتھ اپنی طبیعت کی لطافت اور شگفتگی کے لیے ہر مجلس میں پسند کیا جاتا تھا، اس کے کلام کا رنگ یہ ہے:

ز صبحدم نفسی پیشتر شدم بیدار　　　لب پیالہ گرفتم بہ بوسہ چون لب یار

خون مرا صریحہ کہ بہر تجمل شوی　　　چون ساقی کہ ریختہ باشد شراب را

خون مرا بریزد و شمر ا سبب مرا مریزہ　　　یک قطرہ زین شراب مستانہ خون برابرا

ہر کہ خیال آن گل خود زدہ تی می کنم　　　دل بہ گمند خیال گل بادی می کنم

وقایع اسد بیگ کے نام سے اپنے کچھ ذاتی کوائف اور اس عہد کے کچھ تاریخی حالات خصوصاً ابو الفضل کے قتل کی تفصیلات لکھی ہیں، جس کے اقتباسات الیٹ جلد ششم میں درج ہیں،[1]

دربار اکبری کے ارباب سخن کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کو ان صفحات پر آسانی سے سمیٹا نہیں جا سکتا،

---

[1] نیز دیکھو میخانہ ص ۵۵۴ و ریاض الشعراء

ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے ہم بقیہ شعراء کے صرف نام لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں بھی ہم ان ہی کے نام درج کرتے ہیں، جو شاہی ملازموں کے زمرہ میں داخل تھے،

ملا قیدی شیرازی، قاسم ارسلان، یادگار حالتی، ظریفی ساوجی، مشفقی بخاری، ملا صبوحی کابلی، حیفی ساوجی، خواجہ ہجری، فریدی، نارغی، وقوعی، خسروی، نیازی سمرقندی، میر حزنی، منظر کشمیری، بہرام سقا، محمد صالح دیوانہ، شریف سرمدی، نازی امیری وغیرہ وغیرہ ان کے کلام کے نمونے طبقات اکبری جلد سوم میں ملیں گے۔

بہت سے ایسے شعرا بھی تھے جنکا دربار سے براہ راست تعلق تو نہ تھا، مگر اپنے قصائد بھیجکر اکبر کے ابر کرم سے سیراب ہوتے رہتے تھے، ان میں ظہوری ترشیزی اور ملک قمی بھی تھے،

ہندو فضلاء اکبر کو ہندوؤں کے علوم و فنون سے جو شغف تھا وہ ظاہر ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ ہندی شاعری میں طبع آزمائی بھی کرتا تھا، اور رائے تخلص رکھتا تھا، ہندو فضلاء کی ایک کثیر جماعت بھی دربار شاہی سے منسلک تھی، ابوالفضل نے "دانش اندوزان جاوید دولت" کے سلسلہ میں خدیو شناسائی کی فہرست میں حسب ذیل ہندوؤں کے نام لکھے ہیں:

مادھو سرستی، مدھوسودن، نارائن آسرم، ہرجی سور، دامودر بھٹ، رام تیرتھ، نرسنگ، پرم اندر، آدت،

"خداوند باطن" کی فہرست میں یہ نام ہیں،

رام بھدر، جدروپ

شناسائے عقلی کلام کے عنوان سے مندرجہ ذیل نام گنائے ہیں:

نارائن، مادھو بھٹ، سری بھٹ، بشن ناتھ، رام کشن، بلبھدر مصر، باسدیو مصر،

بابن بھٹ، بدیانواس، گوری ناتھ، گوپی ناتھ، کشن پنڈت، بھٹا چارج، بھاگیرت بھٹاچارج
کاشی ناتھ بھٹاچارج، مہادیو، بھیم ناتھ، نرائن، سیوجی۔[۱]

کتب خانہ اکبر کے علمی ذوق کے سبب جو کتب خانہ قائم ہوا، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثل تھا، قلعہ آگرہ میں مثمن برج کے بغل میں جو لمبا کمرہ ہے، وہیں شاہی کتب خانہ تھا، ہمایوں کے کتب خانہ کی جتنی کتابیں تھیں وہ وراثت میں ملیں، اس کے علاوہ مختلف مقامات اور اشخاص سے وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتی رہیں، اہل قلم جو کتابیں لکھتے ان کا ایک نسخہ خزانہ عامرہ میں ضرور بھیجتے، اکبر کے درباری مصنفوں کی تصنیفات و تالیفات۔ د تراجم خود ا... کثرت سے تھے کہ ان کے کئی کئی نسخے شاہی کتب خانہ میں رہتے، پھر اکبر کو فتوحات کے سلسلہ میں جتنی کتابیں دستیاب ہوتیں ان کو خزانہ عامرہ میں داخل کر لیتا فتح گجرات کے زمانہ میں اعتماد خان گجراتی سے بہت سی نفیس اور نادر کتابیں حاصل ہوئیں، ان میں سے بعض تو شاہی کتب خانہ میں داخل کر لی گئیں اور بعض اہل ذوق کو دیدی گئیں، ملا عبد القادر بدایونی کو اس تقسیم میں انوار المشکوٰۃ کا نسخہ ملا۔[۲] فیضی کے انتقال کے بعد اس کی تمام کتابیں شاہی کتب خانہ میں منتقل کر دی گئیں ا... ن کی کل تعداد ۴۳۰۰ تھی، جو اکثر مصنفون کے ہاتھ ... یا ان کے عہد کی لکھی ہوئی تھیں، ان کتابوں کا مجموعہ تین حصوں میں منقسم تھا، پہلے میں نظم، طب، نجوم اور موسیقی کی کتابیں اور دوسرے میں حکمت، تصوف، ہیئت، ہندسہ کی اور تیسرے میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی تھیں،[۳] خیال کیا جاتا ہے کہ اکبر کے کتبخانہ میں ۲۴ ہزار کتابیں تھیں، جو زیادہ تر شا... کی لکھی ہوئی تھیں، ماثر الامراء جلد دوم (ص ۶۱۱) میں ہے کہ ایک روز شہزادہ سلیم ابو الفضل کے گھر گیا تو چالیس کاتبوں کو کلام پاک اور تفسیر نقل کرتے ہوئے دیکھا، ظاہر ہے کہ شاہی کتب خانہ کے لیے اور بھی زیادہ کاتب اور خوشنویس مقرر

---

[۱] آئین اکبری [۲] بدایونی جلد دوم ص ۲۰۲ [۳] ایضاً ص ۳۰۵

ہوں گے، خوشنویسوں کے علاوہ مقابلہ نویس، مصحح، نقاش، جدول ساز، جلد ساز اور مصور بھی

اکبر خاص طور سے بعض کتابوں کو مصور کراتا تھا، ان میں تصویریں اور شبیہیں بنواتا مرقعے تیار کراتا کتابوں کی لوح و جدول مطلّا کراتا تھا، قصۂ امیر حمزہ کی بارہ جلدیں اس کی فرمایش سے مصور کی گئی تھیں، اور اس میں استادانِ سحر پرداز نے ۱۴۰۰ تصویریں بنائیں اسی طرح چنگیز نامہ، ظفر نامہ، اقبال نامہ، رزم نامہ (مہابھارت)، رامائن، نل دمن، کلیلہ دمنہ، اور عیارِ دانش، نقش و نگار سے آراستہ ہوئیں[1]،

یہاں پر بے محل نہ ہوگا اگر دربارِ اکبری کے ان خطاطوں اور خوشنویسوں کا تذکرہ کیا جائے، جنھوں نے شاہی کتب خانہ کی زینت اپنے کمالِ فن سے بڑھائی اور جن کی قدردانی اکبر نے جاگیر، منصب اور خطابات دے کر کی،

(۱) ملا محمد حسین کشمیری، نستعلیق کے استاد تھے، اکبر نے زریں قلم کا خطاب دیا تھا، ابوالفضل ان کو جادو رقم لکھتا ہے[2]،

(۲) خواجہ عبد الصمد شیریں رقم، خواجہ نظام الملک وزیر شاہ شجاع شیرازی کے بیٹے تھے، ہمایوں کے دربار میں خوشنویس تھے، نستعلیق کے استاد اور مصور تھے، اپنے فن کی مہارت کے لحاظ سے شیریں قلم کہلاتے تھے، اکبر کے عہد میں چہار صدی منصب عطا ہوا، اور فتح پور سیکری ٹکسال کے افسرِ اعلیٰ مقرر ہوئے، خشخاش کے دانے پر سورہ اخلاص لکھی تھی[3]،

(۳) میر معصوم قندھاری اکبری دور کے مشہور خطاط ہیں، فتح پور سیکری کی اکثر عمارات پر ان کے کتبے کندہ ہیں،

(۴) حسین بن احمد چشتی، یہ بھی اس دور کے عربی کے باکمال خطاط تھے، فتح پور سیکری

---

[1] آئین اکبری ص۶۸ [2] ایضاً ص۱۰۹ و تذکرہ خوشنویسان ص۷۹ [3] ایضاً ص۱۱۰ و مآثر الامرا، ج ۲

کے بلند دروازے کے پیش طاق کی محراب کے اوپر ابھرے ہوئے حروف میں جو عربی کتبہ ہے وہ انہی کے کمال کا نمونہ ہے،

خط نستعلیق کے دوسرے باکمال اساتذہ مولانا میر علی ہروی، مولانا جعفر تبریزی، مولانا اظہر، مولانا محمد اوبہی، مولانا سلطان علی مشہدی، میر حسین کلنگی، مولانا عبد الرحیم، میر عبد اللہ نظامی وغیرہ تھے، خط تعلیق کے ماہروں میں مولانا عبد الحیٔ، منشی ابو سعید مرزا، مولانا ابراہیم استرابادی، منشی محمد جمال الدین قزوینی وغیرہ تھے، اکبر کا میر منشی اشرف خاں اس خط کے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا،[1]

ان خوشنویسوں کے علاوہ بہت سے ایسے خطاط تھے جو دوسرے رسم الخط مثلاً ثلث، توقیع، محقق، ریحان، رقاع اور غبار کے لکھنے میں بہت مشاق تھے (دیکھو آئین اکبری ص۷۵)

مدارس اکبر نے علم کی نشر و اشاعت کے لیے متعدد مدارس قائم کیے، آگرہ میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں تعلیم و تعلم کے لیے چلپی بیگ نام ایک عالم کو شیراز سے بلایا، (اکبر نامہ دفتر اول) فتحپور سیکری میں پہاڑی کے اوپر ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا جس کے مقابلہ میں کوئی سیاح کسی دوسرے مدرسہ کا نام نہیں بتا سکتا تھا،[2] ان تعلیم گاہوں کے علاوہ بہت سے ایسے بھی مدارس تھے جن کو امراء اور دوسرے لوگوں نے قائم کیے، مثلاً دہلی میں ماہم بیگم کا مدرسہ جو خیر المنازل کے نام سے موسوم تھا، ابو الفضل کا مدرسہ فتحپور سیکری میں قائم تھا، میر عبد الرحیم خانخاناں کے مختلف مدارس تھے، ان کے سوا بہت سے علماء اور فضلاء اپنے اپنے مقامات پر علوم و فنون کی ترقی اور افراد قوم کی تعلیم و تربیت میں مصروف تھے، اور ان کی اعانت شاہی دربار سے برابر ہوتی رہتی تھی، تاریخ بدایونی میں ان مدرسوں کی تفصیلات درج ہیں، ہم طوالت

---

[1] آئین اکبری ص۷۵۔ [2] آئین اکبری، ذکر دار الخلافہ صوبہ آگرہ،

کے خیال سے نظر انداز کرتے ہیں۔

مگر چونکہ اس سلسلہ میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اکبر نے بچوں کی تعلیم کے لیے بعض ایسے طریقے ایجاد کیے تھے جو آج ابتدائی تعلیم کے جدید طریقوں کے بالکل مشابہ تھے۔ فارسی حروف بچوں کے ذہن نشین کرانا آسان نہیں، خصوصاً ہندو بچوں کے لیے اور بھی دشوار تھا، کیونکہ ان کی تمام تحریریں بائیں سے داہنے جانب لکھی جاتی ہیں، چنانچہ حروف آموزی کے طریقہ کو سہل بنانے کے لیے اکبر نے ہدایت دی کہ استاد بچوں کو مفرد حروف پہچنوائے، پھر اعراب اور مرکب حروف، پھر چھوٹے چھوٹے جملے، اس کے بعد اشعار اور طویل عبارتیں، یہ طریقہ تعلیم کامیاب ثابت ہوا اور لڑکے جو برسوں میں سیکھتے وہ دنوں میں حاصل کر لیتے،

آئینِ اکبری کی عبارت یہ ہے:

بفرمودۂ گیتی خداوند حروف تہجی (ا، ب، ت، ث) را بنویسند و دیگرگون پیکر را بدانان نگارند، نشست و نام آشنا گردند و دو روز بیش نکشد که از نقوش حروف پیوسته آگہی گیرند و چون ہفتہ بدین روش گذرد نظم و نثر آشنا سازند و بیتی ایزدی و اندرزگزاری جداگانہ نوشتہ آموزندہ فرا گیرد و ہر یک را جداگانہ خواند و استاد دستگیری کند و چندے ہر روز یک مصرع یا یک بیت بانیم سطر بنویسد و کمتر زمانے سواد خوانی نقش پذیرد و آن دستگاہ ہر روز از پنج چیز آگہی بجوید شناسائی حروف، الفاظ، مصرع، بیت، پیشین خواندہ بدین روش آنچہ سالہا آموختی بماہہا بلکہ بروزے کشید و بشگفتی فرو رفتند۔[1]

ابوالفضل نے ان مختلف علوم و فنون کی فہرست بھی دی ہے، جو اس زمانہ میں پڑھائے جاتے تھے، اور وہ حسبِ ذیل ہیں: اخلاق، حساب، سیاق، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیرِ منزل، سیاست، طب، منطق، طبعی، ریاضی، الٰہی، تاریخ، یا آن، بیدانت، پاتنجل، یہ گویا اعلیٰ تعلیم کا نصاب تھا۔[2]

۱؎ آئینِ اکبری
۲؎ ایضاً

جہانگیر

جہانگیر دعاؤں سے پیدا ہوا، حوصلوں اور تمناؤں میں پلا اور ناز و نیاز کے ساتھ بڑھا۔ ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم و کمال کے گہوارہ میں پایا، جب چار سال چار مہینے اور چار روز کا ہوا، تو علم پرور باپ نے اس کے رسم کتب کی تقریب انجام دی[1]، اور ملک الشعرا فیضی اور مولانا میر کلاں ہروی محدث کو اس کی تعلیم کے لیے مامور کیا، قطب الدین خان آتکہ، اور عبدالرحیم خانخانان اس کے اتالیق مقرر ہوئے، مولانا علی احمد نشانی بھی اس کے استادوں میں تھے، یہ ہیئت، طبیعیات، املا، انشا اور خطاطی میں اپنی نظیر آپ تھے[2]، جہانگیر نے چہل حدیث سید صدر جہاں سے پڑھی[3]، ایسے استادوں اور اتالیقوں کے فیض تعلیم کا جو خوشگوار نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا، وہ علم و سخن کے آسمان پر ماہتاب بن کر چمکا،

عبدالرحیم خانخانان سے اس نے ترکی زبان سیکھی، وہ خود لکھتا ہے کہ "باوجودیکہ میں نے ہندوستان میں پرورش پائی ہے، لیکن ترکی زبان کے بولنے اور لکھنے سے عاری نہیں ہوں"، تزک بابری کے آخر میں کچھ اجزا ترکی زبان میں لکھکر اضافہ کئے ہیں،

فارسی زبان کا وہ ایک بے مثل انشا پرداز تسلیم کیا جاتا ہے، اس کا علمی شاہکار خود اسکی تزک ہے، جو سادگی، صفائی، بے تکلفی، بے ساختگی اور قادر الکلامی کے لحاظ سے بے عدیل ہے، مولانا شبلی کی رائے میں اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات کو ایسے بے تکلف

---

[1] طبقات اکبری جلد دوم ص۲۷۔ [2] بدایونی جلد سوم ص۲۴۹۔ [3] مآثر الکرام جلد دوم ص۹۳۔

برجستہ اور دلآویز طریقہ سے ادا کرتا ہے، کہ بڑے بڑے انشاپرداز نہیں کر سکتے" وہ جب کسی جنگ کی ہنگامہ آرائیوں کی تصویر کھینچتا ہے تو ہم میدان کارزار میں کھڑے نظر آتے ہیں، جب کسی جشن کی چہل پہل یا شبستان عیش کا نقشہ کھینچتا ہے تو آنکھوں کے سامنے اس کی ساری رنگینیاں اور سرمستیاں آ جاتی ہیں، جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتا ہے تو اس کے ہر پہلو کو نمایاں کر دیتا ہے، جب وہ کسی مقام کا ذکر کرتا ہے تو ایک محقق جغرافیہ دان کی طرح اس کے سارے معلومات فراہم کر دیتا ہے، جب ایک شہر کی تاریخ اور وہاں کے لوگوں کے رسوم و عادات کو تحریر کرتا ہے. تو ایک مورخ کی شان میں نظر آتا ہے، وہ جب پھولوں، پھلوں، پرندوں اور جانوروں کی جزوی تفصیلات کو بیان کرتا ہے. تو نہ صرف زبان کا لطف قائم رکھتا ہے بلکہ نباتات اور حیوانات کے ماہر ہونے کا ثبوت بھی دیتا ہے. یہاں چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

۱۶۱۲ء میں عثمان خان افغانی نے بنگالہ میں بغاوت کا علم بلند کیا، اس کے استیصال کے لیے جہانگیر نے شاہی لشکر بھیجا، اس جنگ کی جو قلمی تصویر اس نے کھینچی ہے، وہ یہ ہے:

ہر کنار کہ زمین آن تمام چہلہ و دلدل بود، جائے جنگ قرار داد، روز یکشنبہ ۹ محرم شجاعت خاں ساعت جنگ اختیار نمودہ افواج قاہرہ را مقرر ساخت کہ ہر یک بجادہ مقام خود رفتہ آمادۂ جنگ باشند. عثمان در آن روز قرار جنگ با خود ندادہ بود، چون شنید کہ لشکرہائے پادشاہی مستعد گشتہ آمدہ اند، ناچار او ہم سوار شدہ بہ کنار نالہ آمد، و سوار و پیادۂ خود را در برابر افواج منصورہ باز داشت، چون ہنگامۂ جنگ گرم گشت و فوج بہ فوج رو بروے خود متوجہ گردید، دریں مرتبہ اول آن جاہل خیرہ سر فیل مست جنگی خود را پیش انداختہ بہ فوج ہراول می تازد، بعد از زد و خورد بسیار از سرداران ہراول سید آدم بارہہ و شیخ اچھے، بدرجۂ شہادت می رسند، سردار برانغار افتخار خان ہم در ستیز و آویز تقصیر

نکرده جان خود را نثار می نماید، وجمعے که با او بودند، آنقدر تلاش می کنند که پاره پاره می شوند، همچنان گروه جرانغار کشور خان داد مردی ومردانگی داده خود را فدائے کار صاحب می سازد، با آنکه تیره بختان نیز بسیارے زخمی وکشته شده بودند، آن مدبر حساب لشکریان را از روے دانستگی وفهمیدگی بخاطر می آورد و مشخص خود می سازد که سرداران هراول وبرانغار و جرانغار کشته شدند، همیں قول مانده از کشته شدن وزخمی گشتن جمعیت خود پروا نکرده در همان گرمی بر قول می تازد ودریں جانب پسر وبرادران وخویشان شجاعت خان ودیگر بنده ها راه بران گمراهان گرفته بر مثال شیران وپلنگان به پنجه ودندان تلاش می کردند، چنانچه بعضے درجهٔ شهادت یافتند، وجمعی که زنده ماندند زخمهاے منکر داشتند، دریں وقت فیل مستی گجپت، نام که فیل اول او بوده بر شجاعت خان می دواند، شجاعت خان دست بر برچه برده بر فیل میزند، آنطور فیل مستی را از برچه چه پروا است، دست به شمشیر برده دو شمشیر پے در پے می زند، از آن هم چه محابا بعد از آن جمدهر کشیده وجمدهر می رساند، بآن هم برنمی گردد وشجاعت خان را با اسپ زیر می کند، بمجرد از اسپ جدا شدن، جهانگیر شاه گفته برمی جهد وجلودار او شمشیر دو دستی بر دستهاے فیل رسانیده چون فیل به زانو در می آید، اتفاقاً جلودار فیلبان را از بالاے فیل بزیر می کشد، وهمان جمدهر که در دست داشت، دریں پیادگی به نوعے بر خرطوم وپیشانی فیل می زند، که فیل از الم آن فریاد زنان بر می گردد، چون زخمها بسیار داشت به فوج خود رسیده می افتد، واسپ شجاعت خان سالم برمی خیزد ودر حینے که سوار می شد، آن مخذولان فیل بر علمدار او می دوانند وعلم او را با اسپ زیر می کنند، واز آنجا شجاعت خان نعرهٔ مردانه برکشیده علمدار را خبر می سازد ومی گوید که مردانه باش من زنده ام ودر پاے علم دریں وقت تنگ هر کس از بندهاے درگاه حاضر بودند، دست به تیر وجمدهر وشمشیر برده

برفیل می دوند، و شجاعت خان هم خود را رسانیده، به علمدار نهیب می دهد، که بر خیزد و اسپ دیگر بهجهت علمدار حاضر ساخته، او را سوار می سازد و علمدار علم را برافراخته بر جائے خود می ایستد در اثنائے این گیر و دار تفنگی بر پیشانی آن مقهور می رسد که زننده آنرا هر چند تفحص کردند، ظاهر شد به مجرد رسیدن، این تفنگ ازاں گرمی باز آمده می داند، که ازین زخم جان بری نیست، تا دو پهر هم با وجود چنیں زخمی منکر مردم خود را به جنگ ترغیب می نمود، معرکه قتال و جدال گرم بود بعد ازان غنیم رو گردانید، و افواج قاهره سر در پے آنها می نهند، و زده زده آن مخذولان را در محلے که دائره کرده بودند، در می آورند، آن مخذولان به تیر و تفنگ مردم را نگاه داشته نمی گذارند که مردم بادشاهی بجا و مقام آنها در آیند چوں ولی برادر عثمان و ممریز پسر او دیگر خویشان و نزدیکان او بر زخم عثمان مطلع می شوند بخاطر می گزرانند که ازین زخم خود او را خلاصی میسر نیست، اگر ما همچنیں شکسته و ریخته به قلعه خود رویم یک کس زنده نخواهد رسید، صلاح در نیست که امشب که درهمیں جا که دائره کرده ایم باشیم و آخر شب فرصت جسته، خود را به قلعه خود رسانیم دو پهر از شب گذشته عثمان بجهنم واصل می گردد،........ الخ[1]

وہ عیش و نشاط کی بزم کی تصویر بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ کھینچتا ہے، تخت نشینی کے بعد پہلے نوروز کے جشن کا مرقع اسطرح سج کر تیار کرتا ہے،

شب سه شنبه یازدهم ذیقعده سنه ۱۰۱۴ هزار و چهارده صبح که محل فیضان نورست حضرت نیراعظم از برج حوت بخانه شرف و خوش حالی خود که برج حمل باشد، انتقال فرمود چون اول نوروز از جلوس همایوں بود، فرمودم که ایوانهائے دولت خانه خاص و عام بدستور زمان والد بزرگوارم در اقمشه نفیسه گرفته، آئینه درغایت زیب و زینت بستند و از روز اول

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۴-۳، ۱، نولکشور پریس.

نوروز تا نوزدہم، در بُرجِ حمل کہ روزِ شرف است خلائق داد عیش و کامرانی دادند، اہلِ ساز و نغمہ از ہر طائفہ و ہر جماعت جمع بودند، لولیان رقاص و دلبران ہند کہ بہ کرشمہ دل از فرشتہ می ربودند، ہنگامۂ مجلس را گرم داشتند. فرمودم کہ ہر کس از کیفات و مسکرات، آنچہ می خواستہ باشند، بخورد، منع و مانعی نباشد۔"

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما   مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما"[1]

تخت نشینی کے بارہویں سال شعبان کی چودھویں تاریخ کو نور جہاں نے ایک مجلس جشن ترتیب دی، اس کا حال جہانگیر اس طرح لکھتا ہے:۔

"آخر ہائے روز پنجشنبہ بست و ششم موافق چہاردہم شہر شعبان کہ شب برات بود، در یکے از منازل و عمارات محل نور جہاں بیگم کہ در میان تالا بہائے کلان واقع است، مجلس جشن نمودم، و امرا و مقربان را دریں مجلس کہ ترتیب دادہ بیگم بود طلب داشتہ حکم کردم کہ بردم پیالہ و اقسام کیفیات بہ مقتضائے خواہش ہر کس بدہند بسیارے پیالہ اختیار نمودند، فرمودم کہ ہر کس کہ پیالہ بخورد بہ مثل منصب و حالتِ خود نشینند، و اقسام کبابہا و میوہا بطریق گزک مقرر شد کہ در پیش ہر کس بنہند، عجب مجلسے منعقد گشت، در آغاز شام براطراف تال و عمارات فانوسہا و چراغہا روشن ساختہ، چراغانے بہم دست داد، کہ تا ایں رسم را معمول ساختہ اند، شاید در ہیچ جا مثل ایں چراغانے نشدہ باشد. جمیع چراغہا و فانوسہا عکس در آب انداختہ بنوعے بہ نظر در می آمد کہ گویا تمام صحن ایں تالاب یک میدان آتش است، بسیار شگفتہ مجلسے گذشت و پیالہ خواراں زیادہ از حوصلہ طاقت پیالہ تناول نمودند"

---

[1] تزک جہانگیری، ص۲۳۰

دل افروز بزمے شہ آراستہ ۔۔۔ بخوبی بدانسان کہ دل خواستہ
فگندند در پیش ایں سبز کاخ ۔۔۔ بساطے چو میدان ہمت فراخ
زبس نکہت بزم می رفت دور ۔۔۔ فلک نافہ مشک بود از بخور
شدہ جلوہ گر نازنیان باغ ۔۔۔ رخ افروختہ ہر یکے چون چراغ[۱]

وہ دقیق فلسفیانہ اور مذہبی مسائل کو اس سادگی، اختصار اور حسن وخوبی سے لکھتا ہے کہ دوسرے اہل قلم شاید صفحے کے صفحے سیاہ کرنے کے بعد بھی ویسی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے، وہ ہندو پنڈتوں کو بتانا چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات مقدس "جسم وچون وچگونگی سے منزہ" ہے، تو لکھتا ہے:-

روزے از پنڈتان کہ عبارت از دانایان ہنود ست پرسیدم کہ اگر منتہائے دین شما بر فرود آمدن ذات مقدس حق تعالیٰ است در دہ پیکر مختلف بطریق حلول آن خود نزد ارباب عقل مردود است و این مفسدہ لازم دارد، کہ واجب تعالیٰ کہ مجرد از جمیع تعینات ست صاحب طول وعرض وعمق بودہ باشد، و اگر مراد ظہور نور الٰہی است دریں اجسام آن خود در ہمہ موجودات مساوی است، و بایں دہ پیکر مختص نیست و اگر مراد اثبات صفتے از صفات الٰہی ست، دریں صورت ہم تخصیص درست نہ زیرا کہ در ہر دین و آئین صاحبان معجزات و کرامات ہستند کہ از دیگر مردمان زمان خود بدانش و فراست ممتاز بودہ اند، بعد از گفت و شنود بسیار و رد و بدل بے شمار بخدائی خدائے منزہ از جسم و چون و چگون معترف گشتند و گفتند کہ چون اندیشہ ما در ادراک ذات مجرد ناقص است، بے وسیلہ صورت را بمعرفت او نمی بریم و ایں دہ پیکر را وسیلہ شناخت و معرفت خود ساختہ ایم، بس گفتم ایں

---

[۱] تزک جہانگیری صفحہ ۱۹۱، نولکشور پریس،

"ایں پیکرہا ئے شمار او سیلہ مقصود بہ معبود تواند بود،"[1]

وہ جب پھولوں کا ذکر کرنے لگتا ہے تو نباتات کے طالب العلم اپنی واقفیت میں نئی معلومات کا بیش قیمت اضافہ کر سکتے ہیں، آگرہ کے شاہی باغ گل افشاں کے پھولوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

اول گل چنپہ گلی ست در نہایت خوشبوئے ولطافت بہیات گل زعفران لیکن رنگ چنپہ زرد مائل بسفیدی ست، درخت آن در نہایت موزونی ست وکلان وپربرگ وشاخ وسایہ دار می شود، یاسم گل یک درخت باغے را معطر دارد، وازان گذشتہ گل کیوڑہ است کہ ہیئت واندام غیر مکرر است، بوئے او در تندی وتیزی بدرجہ ایست، کہ از بوئے مشک ہیچ کمی ندارد دیگر رائے بیل کہ در بو از عالم یاسمین سفید است، غایتاً برگہا یش دو سہ طبقہ بر روئے ہم واقع شدہ، دیگر گل مولسری است، کہ درخت آن نیز بسیار خوش اندام وموزون وسایہ دار است، وبوئے گل آن در نہایت ملائیت دیگر گل سیوتی کہ از عالم گل کیوڑہ است، غایتاً کیوڑہ خار دار است، وسیوتی خار ندارد، رنگ آن بزردی مائل است وکیوڑہ سفید رنگ ست ازیں گلہا واز گل چنبیلی کہ یاسمن سفید ولایت ست، روغن ہائے خوشبو می سازند،[2]

جانوروں کی تصویر جب وہ کھینچتا ہے، تو وہ اتنی صاف اور واضح ہوتی ہے کہ علم الحیوانات کے ماہرین اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، ۱۰۲۱ھ میں مقرب خان کھمبائت سے ایک عجیب وغریب جانور ساتھ لایا، اس کا بیان جہانگیر جس طرح کرتا ہے، وہ انشاپردازی، اور لطافت بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے، ملاحظہ ہو:

"یکے از جانوران در جثہ از طاؤس مادہ کلان تر، واز نر فی الجملہ خورد تر گاہے کہ در مستی جلوہ نماید، غم خود را ودیگر پرہا را طاؤس آسا پریشان می سازد، وبرقص در می آید، سروگردن وزیر حلقوم او ہر ساعت برنگے ظاہر می گردد، وقتیکہ در مستی ست سرخ سرخ است، گویا کہ تمام زیر

[1] تزک جہانگیری ص ۱۵۱ نولکشور
[2] ایضاً ص ۱۲۵

بہ مرجان مرصع ساختہ اند، و بعد زمانے ہمیں جا ہا سفید می شود، و بہ طریق پنبہ بہ نظر در می آید، بوقلموں آسا ہر زمان برنگے دیگر دیدہ می شود، و دو پارچہ گوشتی کہ بر سر دارد، بتاج خروس مشابہ است، غریب این است کہ در ہنگام مستی پارچۂ گوشت مذکور بطریق خرطوم از بالاے سر او تا یک وجب می آویزد و باز کہ آنرا بالا می کشد، چوں شاخ کرگدن بر سر او مقدار دو دانگشت نمایاں می گردد، اطراف چشم او ہمیشہ فیروزہ گون ست[1]"

جہانگیر جب کسی جگہ کے کیف پرور اور خمار آگین مناظر سے متاثر ہوتا تھا، تو اپنے کیفیات و جذبات کو اسی انداز سے تحریر میں لاتا تھا، کشمیر کو دیکھا تو اپنے کیف و مستی کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

کشمیر باغے است ہمیشہ بہار یا قلعہ ایست آہنیں حصار بادشاہاں را گلشنے است عشرت افزا و درویشان را خلوتکدۂ دلکشا، چمنہاے خوش و آبشار ہاے دلکش از شرح و بیان افزون و آبہاے رواں و چشمہ سارہاے از حساب و شمار بیرون، چندانکہ نظر کار کند سبزہ است و آب رواں، گل سرخ و بنفشہ و نرگس خودرو صحرا صحرا انواع گلہا و اقسام ریاحین ازان بیشتر است کہ بشمار در آید، در بہار جاں نگار کوہ و دشت از اقسام شگوفہ مالا مال، در و دیوار و صحن و بام خانہا از مشعل لالہ بزم افروز و چلکہاے مسطح و سہ برگلہاے میروج باچہ گوید،

شدہ جلوہ گر نازنینان باغ	رخ آراستہ ہر یکے چون چراغ
شدہ مشک بو غنچہ در زیر پوست	چو ن تعویذ مشکیں بباز وے دوست
غزل خوانی بلبل صبح خیز	تمناے مے خوارگان کردہ تیز
بہر چشمہ منقار بط آب گیر	چو مقراض زرین بقطع حریر
بساطِ گل و سبزہ گلشن شدہ	چراغ گل از باد روشن شدہ

[1] تزک جہانگیری بحوالہ مقالات شبلی نعمانی جلد چہارم ص ۱۰۵-۱۰۴،

بنفشہ سر زلف را خسم زدہ گرہ در دل غنچہ محکم زدہ[1]

جب وہ سوگوار اور مغموم ہوتا ہے، تو بڑے دردناک پیرایہ میں اپنے غم کا اظہار کرتا ہے خسرو کی ماں اس کی باغیانہ اور ناشایستہ حرکتوں سے عاجز آ کر افیون کھا لیتی ہے، اس کی موت پر جہانگیر جس طرح ماتم کرتا ہے وہ ملاحظہ ہو:-

از خوبی ہا و نیکذاتی ہاے او چہ می نویسم عقلے بہ کمال داشت، واخلاص او بمن در درجہ بود کہ ہزار پسر و برادر را قربان یک موے من می کرد، مکرر بہ خسرو مقدمات نوشت و اورا دلالت بہ اخلاص و محبت من می کرد، چون دید کہ ہیچ فائدہ ندارد ...... از غیرتے کہ لازمۂ طبیعت راجپوتانی است، خاطر بر مرگ خود قرار دادہ ...... روز بیست و ششم ذی الحجہ ۱۰۱۳ھ افیون بسیار در عین سوزش دماغ خوردہ در اندک زمانے درگذشت ...... از فوت او بنابر تعلقے کہ داشتم ایامے بر من گذشت کہ از حیات و زندگانی خود ہیچ گونہ لذتے نہ داشتم چہار شبانہ روز کہ سی و دو پہر باشد از غایت کلفت و اندوہ چیزے از ماکول و مشروب دارد طبیعت نہ گشت، چون این قصہ بہ والد بزرگوارم رسید دلاسا نامہ مرحمت بدین مرید فدوی صادر گشت و خلعت و دستار مبارک کہ از سر برداشتہ بودند، ہمایون طور بستہ بجہت من فرستادند، این عنایت آبے بر آتش سوز و گداز من زدہ اضطراب و اضطرار مرا فی الجملہ قرارے و آرامی بخشید[2]

جہانگیر کی یہ قادر الکلامی صرف نثر ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ نکتہ سنج و ادیب ہونے کے ساتھ وہ شعر و شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتا تھا، بقول مولانا شبلی "سلسلۂ تیموریہ میں یوں تو ہر فرمانروا سخن فہم و ادا شناس گذرا ہے، لیکن جہانگیر اس فن میں اجتہاد رکھتا تھا، وہ فطرۃً محبت کیش تھا، اور ازل سے درد مند دل لے کر آیا تھا، اس کا اثر اگرچہ اس نے آئین و نظام سلطنت میں چنداں نمایاں نہونے دیا، لیکن

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۳۰۳، [2] ایضاً صفحہ ۲۷

تزک میں نور جہاں کا جہاں جہاں ذکر آیا مطلق نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نام اس کی زبان سے لذت لے کر نکلتا ہے، تاہم عشق اس کا خمیر تھا، اور چونکہ فیضی کا شاگرد رشید تھا، اس لیے شعر و شاعری کا نکتہ داں اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔" (شعر العجم حصہ سوم ص۱۶۵)

وہ خود شاعر تھا، چنانچہ مندرجہ ذیل اس کی ایک غزل ہے، جو سلاست اور رنگینی بیان کے لحاظ سے خوب ہے،

من چون کنم کہ تیر غمت بر جگر رسد ۔۔۔ تا چشم نارسیدہ دگر بر دگر رسد
مستانہ می خرامی و مست تو عالمی ۔۔۔ اسپند می کنم کہ مبادا نظر رسد
در وصل دوست مستم و در ہجر بیقرار ۔۔۔ داد از چنین غمے کہ مرا سر بسر رسد
مدہوش گشتہ ام کہ بپویم رہ وصال ۔۔۔ فریاد ازان زمان کہ مرا این خبر رسد
وقت نیاز و عجز جہانگیر ہر سحر ۔۔۔ امید آنکہ شعلۂ نور و اثر رسد[1]

مصنف مخزن الغرائب نے جہانگیر کے جو چند اشعار نقل کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

ما ناکہ بہ برگ گل نوشتیم ۔۔۔ شاید کہ صبا بار رساند

رباعی

ہر کس بضمیر خود صفا خواہد داد ۔۔۔ آئینۂ خویش را جلا خواہد داد
ہر چہ کہ شکستہ بود دستش گیر ۔۔۔ بشنو کہ ہمیں کاسہ صدا خواہد داد

رباعی

اے آنکہ غم زمانہ پا کت خوردہ ۔۔۔ اندوہ دل و وسوسہ تاکت خوردہ
مانند قطرہائے باران بزمین ۔۔۔ جا گرم نکردہ کہ خاکت خوردہ[2]

---

[1] تزک جہانگیری ص۳۱، [2] مخزن الغرائب قلمی نسخہ مملوکہ دار المصنفین، ورق ۱۰۵،

وہ اکثر اساتذہ کے مقابلہ میں شعر کہتا، ایک بار امیر الامرا کا یہ شعر اس کے سامنے پڑھا گیا،

بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق　　یک زندہ کردنِ تو بصد خوں برابر است

جہانگیر نے فوراً یہ شعر موزوں کیا،

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس　　یک دل شکستنِ تو بصد خون برابر است[1]

مولانا علی احمد نشانی نے بھی اس پر ایک شعر کہا، جو جہانگیر کو بہت پسند آیا؛

اے محتسب زگریۂ پیر مغان بترس　　یک خم شکستنِ تو بصد خون برابر است[2]

ایک دفعہ عبد الرحیم خان خانان نے مولانا جامی کی ایک غزل پر غزل لکھی جس کا ایک مصرع یہ ہے

بہر یک گل زحمتِ صد خار می باید کشید

جہانگیر کو یہ مصرع پسند آیا اس نے فی البدیہہ یہ مطلع کہا،

ساغرے بر رخ گلزار می باید کشید　　ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید[2]

ماوراء النہر کے درویش صفت بزرگ خواجہ ہاشم سے جہانگیر خاص عقیدت رکھتا تھا،
ایک بار خواجہ مذکور کے یہاں اس نے ایک ہزار مہر جہانگیری اور اسی کے ساتھ اپنی کہی ہوئی
مندرجۂ ذیل رباعی بھیجی،

اے آنکہ مرا مہر تو بیش از بیش است　　از دولت یاد بود تست اے درویش است
چندانکہ ز مژدہ ات دلم شاد شود　　شادیم ز آنکہ لطفت از حد بیش است

اسی کے ساتھ جہانگیر نے دربار میں فرمائش کی، کہ اسی مضمون کی اور رباعیاں کہہ کر طبع آزمائی کیجائے
حکیم مسیح الزمان[3] نے ایک رباعی کہی، جو جہانگیر کو بہت پسند آئی، وہ رباعی یہ تھی:-

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۱۲　[2] اقبال نامۂ جہانگیر و تزک جہانگیری ص ۲۳۵　[3] نام ضیاء الدین کاشان سے ہندوستان
آیا، علم طب کا ماہر تھا، اس لیے جہانگیر نے مسیح الزمان کا خطاب دیا، شاعر بھی تھا، تذکرہ نصرآبادی میں اسکے بہت سے اشعار منقول ہیں (ص ۶)

دایم اگرچہ شغل شاہی در پیش / ہر لحظہ کنیم یاد درویشان پیش

گر شاد شود ز ما دل یک درویش / آنرا شمریم حاصل شاہی خویش

جہانگیر نے خوش ہو کر حکیم مذکور کو ایک ہزار مہر انعام میں دیا۔[1]

سنہ ۶ جلوس شاہی میں جہانگیر موضع سمونگر شکار کے لیے گیا، اسی شکار گاہ میں ایک رات اس نے یہ شعر کہا:-

بود بر آسماں تا مہر را نور / مبادا عکس او از چتر شہ دور

اور قصہ خوانوں کو تاکید کی کہ سلام وصلوٰۃ بھیجتے وقت یہ شعر بھی پڑھا جائے۔[2]

ایک شکار گاہ میں جہانگیر کے شیر نے ایک کالے ہرن کا شکار کیا وہ گرا تو غایت خوشی میں جہانگیر چلا اٹھا،

چیتہ پادشاہ زد کالہ

طالب آملی بھی ساتھ تھا، اس نے برجستہ کہا

گشت صحرا ز خون پر از لالہ

جہانگیر نے مسرور ہو کر پانچ ہزار روپے انعام طالب کو دیے، (تذکرہ سرخوش قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی)،

ایک بار جہانگیر نے پانی پینے کو مانگا، مٹی کے کوزہ میں پانی لایا گیا، کوزہ بہت ہی نازک، پانی لانے والے کے ہاتھ میں جنبش ہوئی تو کوزہ ٹوٹ گیا، جہانگیر نے اپنے ہم زلف نواب قاسم خان یعنی نور جہان کی حقیقی بہن منیجہ بیگم کے شوہر کی طرف دیکھکر فوراً کہا

کاسہ نازک بود و آب آرام نتوانست کرد

قاسم خاں نے بھی فی البدیہہ عرض کیا،

---

[1] تزک جہانگیری ص۱۵ [2] ایضاً ص۱۰۰

دید حالم را و چشمش ضبط اشک خود نکرد   کاسہ نازک بود و آب آرام توانست کرد[۱]

۱۲ سنہ جلوس میں سید عبد اللہ خان بارہہ شاہزادہ خرم کی یہ عرضداشت لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ عادل خان، عنبر اور دکن کے تمام سرکشوں نے اطاعت اختیار کرلی ہے، جہانگیر یہ مژدہ سنکر نہایت خوش ہوا، اور شادیانے کے نقارے بجوائے، سید عبد اللہ خان کو سیف خان کا خطاب دیا، شہزادہ خرم کے لیے ایک لعل بے بہا بھجوایا، اور عادل خان کے نام فرمان جاری کیا، جس میں اپنا یہ شعر لکھ بھیجا،

شدی از التماس شاہ خرم   بفرزندی ما مشہور عالم[۲]

اس کے دوسرے سال عادل خان نے جہانگیر کی ایک تصویر کی درخواست کی، جہانگیر نے ایک لعل گراں بہا و لعل خاصہ کے ساتھ اس کو اپنی تصویر عنایت کی، اور اس پر یہ رباعی دست خاص سے لکھ دی،

اے سوے تو دایم نظر رحمت ما   آسودہ نشین بسایۂ دولت ما
سوے تو شبیہ خویش کردیم روان   تا معنی ما بہ بینی از صورت ما[۳]

۱۴ سنہ جلوس میں جہانگیر کلانور میں مقیم تھا کہ خان عالم جو شاہ عباس کے پاس ایران قاصد بنا کر بھیجا گیا تھا، واپس آیا، جہانگیر اس کے ساتھ بہت ہی لطف و عنایت کے ساتھ پیش آتا تھا، جب اس کے نزدیک آنے کی خبر ہوئی تو اس نے اسے مندرجہ ذیل مطلع لکھ کر عطر جہانگیری کے ساتھ بھیجا،

بسویت فرستادہ ام بوے خویش   کہ آرام تر زود تر سوے خویش[۴]

جہانگیر کے شاعرانہ ذوق کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سکوں پر بھی اس کا اظہار

---

[۱] مرآۃ الخیال صفحہ ۱۳، [۲] تزک جہانگیری صفحہ ۱۹۳، [۳] ایضاً صفحہ ۲۴۶، [۴] ایضاً صفحہ ۲۸۰

چاہتا تھا، چنانچہ سو تولے، پچاس تولے، بیس تولے، اور دس تولے کی مہروں پر یہ بیت لکھی ہوئی تھی،

بخط نور بر زر کلکِ تقدیر رقم زد شاہ نور الدین جہانگیر

او مصرعوں کے درمیان کی جگہ چھوڑ کر کلمہ اور دوسری طرف یہ بیت جس سے تاریخ بھی نکلتی ہے، منقش تھی،

شد چو خورزین سکہ نورانی جہاں آفتابِ مملکت تاریخ آن

ایک دوسرے سکہ پر یہ شعر تھا،

روے زر را ساخت نورانی برنگ مہرو ماہ شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

جب نور جہاں کا اقتدار ہوا تو سکہ پر یہ شعر ثبت کیا،

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور بنام نور جہان بادشاہ بیگم زر

جہانگیر کی سخن فہم اور ذوق شناس طبیعت کبھی یہ گوارا نہیں کرتی تھی، کہ اس کے سامنے شاعری میں کسی قسم کی بدمذاقی کی جائے، ایک دفعہ ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں قصیدہ لکھکر پیش کیا، مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا،

اے تاجِ دولت برسرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے کہا عروض بھی جانتے ہو؟ شاعر نے کہا حضور نہیں، جہانگیر نے کہا اچھا ہوا، ورنہ تمھارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کرکے بتایا، کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے، "لت برسرت" اور یہ سخت بے ادبی ہے،

مولانا شبلی تذکرۂ سرخوش سے شعر العجم حصہ سوم میں ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں تنی تخلص کا ایک شاعر تھا، جو قوم کا کلال تھا، کلالوں کی قوم شاہی درباروں میں دربانی اور چاؤشی کے لیے مخصوص تھی، تنی نے نور جہاں بیگم کے توسل سے جہانگیر کے دربار میں شاعری

کی تقریب سے رسائی پیدا کرنی چاہی، جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاوشی اور سواری کا اہتمام ہے، ان کو شاعری سے کیا مناسبت، لیکن نورجہاں کی خاطر عزیز تھی، اجازت دی، مئی نے یہ شعر پڑھا۔

مئی بگریہ سرے وار داے نصیحت گر کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان است

جہانگیر نے کہا دیکھا وہی اپنے پیشہ کی رعایت، دوسرے موقع پر پھر نورجہاں بیگم نے تقریب کی، مئی نے مطلع پڑھا:

من می روم و برق زنان شعلۂ آہم اے ہم نفسان دور شوید از سر راہم

جہانگیر نے ہنس کر کہا وہ اثر کہاں جا سکتا ہے۔[1]

یہاں پر بے موقع نہ ہوگا کہ اگر ہم ان اشعار کا ذکر کریں جن کو جہانگیر نے خاص طور پر پسند کیا، اور ان پر اپنی رائے ظاہر کی، تاکہ ناظرین کو اس کا صحیح مذاق معلوم ہو، مولانا شبلی لکھتے ہیں، کہ جہانگیر کا ذوق شاعری اس قدر صحیح تھا، جس قدر ایک بڑے نقاد فن کا ہو سکتا ہے، جس شاعر کی نسبت اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس سے بڑھ کر اس کے متعلق لکھا نہیں جا سکتا،

سنہ ۱۳ جلوس میں مانڈو (فتح پور) کے ایک تال کے قریب قروکش ہوا تو وہاں ایک ستون پر ایک رباعی لکھی ہوئی دیکھی، اس کے بارے میں لکھتا ہے:

در میان تال نشیمنے از سنگ واقع است بر یکے از ستون ہا رباعی شخصے ثبت نمودہ بود بنظر در آمد و مرا از جا در آورد، الحق از شعرہاے خوب است"، رباعی

یاران موافق ہمہ از دست شدند در دست اجل یگان یگان پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر یک لحظہ زما پیشتر ک مست شدند

اس کے بعد فوراً ہی لکھتا ہے:

[1] تذکرۂ سرخوش در ذکر مئی، و شعر العجم حصہ سوم ص ۹۰،

"درین وقت رباعی دیگر ہم ازین عالم شنیده شد، چون بسیار خوب گفته آن را نیز نوشتم"

رباعی

افسوس کہ اہل خرد و ہوش شدند — از خاطر ہمدمان فراموش شدند
آنانکہ بصد زبان سخن می گفتند — آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند[1]

ایک بار سلطان قوام کے بیٹے حسینی کی ایک رباعی اس کے سامنے پڑھی گئی جو اس کو پسند آگئی ہے، اس نے تزک میں اسے نقل کیا ہے،

گردے کہ ترا ز طرف داماں ریزد — آب از رخ سرمۂ سلیمان ریزد
گر خاک درت بامتحان بفشارند — از وے عرق جبین شاہان ریزد

اس رباعی کو نقل کر کے وہ لکھتا ہے:-

"معتمد خان درین وقت رباعی خواند، مرا بغایت خوش آمد، در بیاض خود نوشتم"

رُباعی

زہرم بفراق خود چشانی کہ چہ شد — خون ریزی و آستین فشانی کہ چہ شد
اے غافل از آنکہ تیغ ہجر تو چہ کرد — خاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد[2]

یہ رباعی بابا طالب اصفہانی کی تھی،

سلطان سنجر کے ملک الشعراء معزی کا ایک قصیدہ جو اس نے سلطان کی مدح میں لکھا تھا، اس کے سامنے پڑھا گیا، جس کا مطلع یہ ہے،

اے آسمان مسخر حکم روان تو — کیوان بپیر بندۂ بخت جوان تو

اس مطلع کو سنکر وہ بہت محظوظ ہوا، اور اس قصیدہ کی تعریف تزک میں کرتا ہے، کہ

---

[1] تزک جہانگیری ص۲۰۶، نولکشور پریس [2] ایضاً ص۲۰۹،

"بغایت سلیس وہموار گفتہ"

سعیدائے زرگر باشی نے اس قصیدہ کے تتبع میں ایک قصیدہ کہکر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جسکو اسنے پسند کیا، اس کی تعریف کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار تزک میں نقل کئے ہیں[۱]:-

اے نہ فلک نمونہ از آستانِ تو   دورانِ پیر گشتہ جوان در زمانِ تو

بخشد دل تو فیض دگر ویدیبب چو مہر   جانہا ہمہ فدائے دل مہربانِ تو

از باغ قدرت است فلک یک ترنج سبز   انداختہ بروے ہوا باغبان تو

یارب چہ گوہری تو کہ افروخت در ازل   جانہائے قدسیان ہمہ از نور جانِ تو

بادا جہان بکام تو اے بادشاہ عہد   در سایۂ تو خرم شاہ جہان تو

اے سایۂ خدا ز تو پر نور شد جہان   بادا ہمیشہ نور خدا سائبان تو

ایک بار ایک ہندو شاعر نے جہانگیر کے سامنے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی جس کا حاصل یہ تھا، کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا، تو کبھی رات نہ ہوتی، کیونکہ جب آفتاب چھپ جاتا، تو اس کا بیٹا اس کے بجائے عالم افروزی کرتا، خدا کا شکر ہے کہ آپکے والد کو خدا نے ایسا بیٹا دیا، کہ لوگوں نے ان کے انتقال کا غم نہ کیا، آفتاب کو رشک ہے کہ آپ کے طالع کی روشنی اور عدالت کے دور سلطنت میں کہیں رات نہیں، جہانگیر اس اچھوتے خیال کو سنکر بہت محظوظ ہوا، اور ایک ہاتھی انعام میں دیا، وہ لکھتا ہے:-

"این تازگی مضمون از شعرائے ہند کم بگوش رسیدہ، بہ جلدوی این مدح فیلے باو مرحمت گردم"

جہانگیر کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا، جو حسب ذیل ہیں:-

گر پسر داشتی جہان افروز   شب نہ گشتی ہمیشہ بودی روز

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۲۱۱، نولکشور پریس

زانکہ چون او نہفتہ افسر زر | بہ نمودی کلاہ گوشہ پسر
شکر کز بہر آن چنان پدرے | جانشین گشت این چنین پسرے
کہ ز شنقار گشتن آن شاہ | کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ[1]

جہانگیر کو طالب آملی کے مندرجہ ذیل اشعار بہت مرغوب تھے،

زغارت چمنت بر بہار منتہا ست | کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند
لب از گفتن چنان بستم کہ گوئے | دہان بر چہرہ زخمی بود و بہ شد
عشق در اول و آخر ہمہ ذوق است و سماع | این شرابے است کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است
گرمن بجائے جوہر آئینہ بودمے | ونما ترا بتو کے می نمودمے
دو لب دارم یکے در می پرستے | یکے در عذر خواہی ہائے مستے

جہانگیر کے اس انتخاب پر مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ "خود طالب اس سے اچھا انتخاب نہیں کر سکتا تھا"[2]

ایران سے **ملا محمد صوفی** مازندرانی ہندوستان آئے تو اپنے زہد، تقوی اور صوفیانہ ذوق کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کے لیے بھی مشہور ہوئے، بتخانہ کے نام سے ایک بیاض ترتیب دی تھی جس میں ساٹھ ہزار اشعار تھے، ان کا ساقی نامہ بہت ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے :-

نمی ماند این بادہ اصلا بآب | تو گوئی کہ حل کردہ اند آفتاب

جہانگیر کو بھی ان سے ملنے کا شوق ہوا، وہ احمد آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، شاہی حکم کے بموجب سیف خان صوبہ دار گجرات نے جو خود بھی ملا صوفی کا معتقد تھا، ان کو دار السلطنت

[1] تزک جہانگیری ص ۔ [2] شعر العجم حصہ سوم ص ۔ [3] تزک جہانگیری ص ۲۸۹ ،

روانہ کیا، مگر راستہ ہی میں مالک حقیقی سے جا ملے، وفات کے وقت یہ رباعی کہی:

اے شاہ، نہ تخت و نہ نگین می ماند — از بہر تو یک دو گز زمین می ماند

صندوق خود و کاسۂ درویشان را — خالی کن و پر کن کہ ہمین می ماند

جہانگیر نے یہ رباعی سنی تو اس پر رقت طاری ہو گئی (مآثر الامرا، جلد سوم ص۵۰۴)

جہانگیر کی خلوت و جلوت میں ساتھ رہنے والے بھی اس کے علمی ذوق سے متاثر ہوئے، ہم اس کے شہزادوں اور نور جہاں بیگم کی علم پروری کا ذکر آیندہ صفحات میں کریں گے، اس کے خسر یعنی نور جہاں کے باپ **اعتماد الدولہ** کو بھی ادب و انشاء سے ذوق تھا، مآثر الامرا جلد اول (ص۱۳۱) میں ہے:

"اعتماد الدولہ اگرچہ شعر نمی گفت اما تتبع شعر متقدمین بسیار کردہ، در انشا ید طولی داشت و شکستہ را متین و آبداری نوشت، و خوش محاورہ رنگین صحبت شگفتہ او بود، و با نویسندگی و معاملہ فہمی نیک اندیش کارروا بود"

اس کے یہاں بھی شعر و شاعری کی مجلس گرم ہوا کرتی تھی، شعرا اس کے دربار میں قصیدے کہتے، اور انعام پاتے، حکیم عارف ایگی نے جس کا ذکر آگے آئے گا، اس کی شان میں حسب ذیل قصیدہ دلآویز انداز میں کہا تھا:

عارف بساز بند / زان زلف تابدار پیچ — تا بر تو نگذرد ہمہ ہر روزگار بہ پیچ

یعنی بہار نوبہار جوانی بیست می — یعنی بموج بادہ بگیر از خمار پیچ

در حلقہ پیچ دارد زلف تو ہمچنانکہ — ہنگام خشم در گرہ چشم مار پیچ

آن اعتماد دولت کز راست بینی اش — از موج خشم جدا نشود از جویبار پیچ

تا در زمانہ پیچ نماند بعہد تو — زان موج آبگیر کشد بہ کنار پیچ [1]

[1] میخانہ ص۲۴۷

جہانگیر کہا کرتا تھا کہ اعتماد الدولہ کی صحبت ہزار مفرح یاقوتی سے بہتر ہوتی ہے، اعتماد الدولہ کے عالم نزع میں جہانگیر نور جہان کے ساتھ اس کے بستر مرگ کے پاس پہنچا تو نور جہان نے باپ سے جہانگیر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ آپ ان کو پہچانتے ہیں اعتماد الدولہ نے اسی حالت میں انوری کا یہ شعر پڑھا:

آنکہ نابینائے مادرزاد اگر حاضر شود | درجبین عالم آرائیش بہ بیند بہترے

جہانگیر کا ہمزلف یعنی نور جہان کی سگی بہن منیجہ بیگم کا شوہر نواب قاسم خان بھی شاعر تھا، اس کا ذکر نور جہان کے سلسلہ میں بھی آئے گا، اسکی ایک غزل ہے،

می پرستم می زچشم جائے آب آید برون | گر بگرید بلبل از چشمش گلاب آید برون
یک رہ اندر چشم من آید خیال او بخواب | کے ز ذوق آن دگر از چشم خواب آید برون
بسکہ میل ہمزبانی با تو دارد ہر کسے | گر ز شکل آئینہ پرسی جواب آید برون
ز اشتیاق ہم نشینی ہائے گوشش وگردنت | بعد ازین ہمچون صدف از حباب آید برون
بسکہ قاسم پرشد از مہر علی موسی رضا | سینہ اش گر بر شگافی آفتاب آید برون

(ماثر الامراء جلد سوم ص ۱۵۱)

جہانگیر کا ندیم خاص محمد شریف تھا، جس کو اس نے معتمد خان کا خطاب دیا تھا، چنانچہ وہ خود کہتا ہے، (ماثر الامراء جلد سوم ص ۱۳۱)

بدور شاہ جہانگیر خانی ارزان شد | شریفہ یا تو بی مارفت و معتمد خان شد

جہانگیر کی تزک لکھنے میں بھی معاون رہا، تزک میں سترہویں جلوس کا کچھ حصہ، اٹھارہویں اور پھر انیسویں جلوس کا کچھ حصہ اسی کا نوشتہ ہے،

جہانگیر کے ایک دوسرے ندیم مرزا محمد ہادی نے تزک کا تکملہ لکھا، اور شروع میں دیباچہ بھی تحریر کیا، معتمد خان نے اقبال نامۂ جہانگیری کے نام سے تیموریوں کی تاریخ تین جلدوں میں لکھی،

پہلی جلد میں تیمور سے ہمایون تک کے حالات تھے، دوسری اکبری عہد کے واقعات پر مشتمل تھی، تیسری میں جہانگیر کے دور کی سیاسی تاریخ ہے، پہلی دو جلدیں مفقود ہیں، لیکن تیسری جلد بنگال ایشیاٹک سوسائٹی سے شائع ہو گئی ہے،

جہانگیر کے امرا میں بہت ہی قابل، بڑا علم دوست، دریا دل اور مشہور شعرا کا ہم پلہ **مرزا غازی خان** تھا، جو مرزا جانی بیگ حلیمی کا لڑکا تھا، اس کو فرزند کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب عطا کر کے قندھار کا حاکم بنایا تھا، اور ٹھٹھ اور ملتان جاگیر میں دیے تھے، اس کے یہاں ارباب کمال کا اجتماع رہتا تھا، ملا مرشد بروجردی، ملا اسد قصہ خوان، طالب آملی اور میر نعمت اللہ وصلی نے اسی کے یہاں تربیت پائی، میخانہ میں ہے:

جوان خوشخوئی خوش روی کریمی بوده، واکثر پاس خاطر ارباب معنی می داشته وباآن جماعت بے تکلفانہ سلوک می کرده، مروتش بمرتبه خوب وسخاوتش بحدی مطلوب بوده،

مولانا شبلی کہتے ہیں کہ ایران سے جو اہل کمال ہندوستان کا رخ کرتے تھے، ان کی پہلی منزل اسی کا آستانہ ہوتا تھا، چنانچہ مآثر الامرا میں ہے کہ فغفوری گیلانی قندھار پہنچا تو غازی خان اس کے ساتھ بہت ہی لطف و کرم سے پیش آیا، مگر فغفوری کو بعض باتیں ناگوار ہوئیں، اس لیے لاہور کی طرف اٹھ کھڑا ہوا، غازی خان نے معذرت لکھ بھیجی، لیکن فغفوری نے قبول نہیں کیا، غازی خان خود بھی بہت ہی بلند پایہ شاعر تھا، قندھار میں ایک شاعر وقاری تخلص رکھتا تھا، غازی خان نے اس تخلص کو ہزار روپے اور خلعت اور ایک گھوڑا دیکر خرید لیا، عالم شباب یعنی پچیس سال کی عمر میں اس کی وفات ہوئی، پھر بھی پانچ ہزار اشعار کا ایک دیوان چھوڑا، میخانہ میں اس کا ایک طویل ساقی نامہ منقول ہے، اسی سے مولانا شبلی نے اس کی بعض غزلوں کے حسب ذیل اشعار منتخب کیے ہیں:

در عہد تو مارا ہمہ باغیر خطاب است | سر پنجہ مژگان و گریبان عتاب است
گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب | ابر ہر چند کہ گرید رخ گلشن خندد
کجاست یک دو سہ ہمدم کہ ہمچو موسیقار | نشستہ پہلوی ہم بر کشیم آوازے

مولانا مرشد بروجردی نے اس کی شان میں بہت سے قصیدے کہے ہیں، ایک قصیدہ کے صلہ میں اس نے مولانا کو مرشد خان کا خطاب دیا، طالب آملی کا بھی ممدوح رہا، طالب کی مداحی تو عاشقی کی حد تک پہنچ گئی تھی،

جہانگیر کے ایک دوسرے جلیل القدر امیر سپہ سالار مہابت خان نے بھی اپنے یہاں علمی مجالس سجائیں، مسیح حکیم رکنا کاشی، آقا تقی صفاہانی، اسد بیگ قزوینی، مولانا حیدر خصالی اور مولانا مرشد بروجردی اس کی فیاضیوں سے مستفید ہوئے[۵]، وہ خود بھی شاعر تھا، سوسنی تخلص کرتا تھا، اس کا حسب ذیل شعر ندرت خیال کے لحاظ سے خوب ہے،

ننگ دلم بود کہ بہشت آرزو کند | دوزخ نصیب من بود و آرزو مباد[۱]

آصف خان مرزا قوام الدین جعفر بیگ بھی دربار کا ایک ممتاز اہل علم تھا، اکبر کے بائیسویں سال جلوس میں عراق سے ہندوستان آیا، اور اپنے چچا مرزا غیاث الدین علی آصف خان بخشی کی وساطت سے شاہی دربار میں روشناس ہوا، رفتہ رفتہ ترقی کر کے جہانگیر کے عہد میں پنجہزاری منصب اور عہدۂ وکالت پر مامور ہوا، اس نے بہت سے حربی کارنامے بھی انجام دیے، اس کے ذاتی اوصاف اور علمی ذوق کے بارے میں مآثر الامرا کا مؤلف لکھتا ہے:

یکتاے روزگار، تھا، ہر فن میں یگانہ اور ہر ہنر میں کامل، اس کے فہم کی تیزی

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھو میخانہ مؤلفہ ملا عبد النبی ص ۲۲۵، ۲۳۴، ۲۸۱، ۵۰۰، ۵۵۱، ۵۵۵، آثر الکرام حصہ دوم ص ۹، مآثر الامرا جلد سوم ص ۲۸۹-۵۰۲، شعر العجم حصہ سوم ص ۱۰، مخزن الغرائب ذکر حیدر خصالی [۲] مآثر الامرا جلد ۳ ص ۴۰۹،

اور نظرت کی بلندی کی بڑی شہرت تھی، وہ خود کہا کرتا تھا کہ جس چیز کو میں فوراً نہ سمجھوں وہ بے معنی ہے، ایک نگاہ سے تمام سطروں کو پڑھ لیتا تھا، اس کو ملکی و مالی معاملات میں بھی غیر معمولی مہارت تھی، اس کا ظاہر اور باطن آراستہ تھا، شعر و انشا میں کمال اور پختگی حاصل تھی (ج ۲ ص ۱۱۲)

جعفری تخلص کرتا تھا، اور اپنی سخن وری کی شہ زوری میں نظامی گنجوی کے تتبع میں ایک مثنوی خسرو شیریں لکھی جس کے بارہ میں مرزا محمد طاہر نصر آبادی اپنے تذکرہ میں رقمطراز ہے:

بعد از شیخ نظامی خسرو شیرین را کسے باز و نگفتہ" (ص ۵۳)

مآثر الامرا جلد اول (ص ۱۱۲) میں بھی ہے:

"باعتقاد جمعے بعد از شیخ نظامی گنجوی مثنوی خسرو شیرین بہ از و کسے نگفتہ"

اس مثنوی کے بہت سے اقتباسات تذکرہ نصر آبادی میں منقول ہیں،

امرائے جہانگیری میں عبدالرحیم خانخاناں کی شعر و سخن کی شمع سب سے زیادہ روشن رہی، پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس کا دربار شعراء کا ایک دار الحکمت تھا، جہانگیری دور میں اس نے بیس سال تک اس روایت کو قائم رکھا،

شعراء کی سرپرستی | جہانگیر کی شہزادگی کے زمانہ ہی سے شعراء اس کے یہاں ملازم تھے، اس کی مجلس شعر و شاعری سے ہمیشہ گرم رہتی تھی، ایک بہت ہی کمسن شاعر جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہ تھی، شہزادہ سلیم کے دربار میں اپنی سخن گستری کی داد لیتا تھا، شہزادہ سلیم ہی نے اس کا تخلص طفلی رکھا تھا، شہزادہ کی شان میں اس نے کئی قصائد کہے، ایک مدح کے کچھ اشعار یہ ہیں:

ایا شہے کہ جہان را از ہنر نان خسل	بدور معدلتت فتنہ پاسبان آمد
امید لطف تو ہست آنچنانکہ عاصی را	گناہ از آتش دوزخ نگاہبان آمد
تو آن کرم کب عزم ترا بروز وغا	ظفر علم کش و اقبال ہم عنان آمد

رساند نامۂ اقبال وش مرغ شرف	کہ عیت شہپرش از اوج لامکان آمد
نوشتہ کاتب قدرت عبارتی کان را	امید ترجمۂ وشوق ترجمان آمد

ملا بدایونی نے اس کمسن بچے کی شعر گوئی پر بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے۔[۱]

میر حیدر رفیعی معمائی کا لڑکا محمد ہاشم سنجر اکبری دور کا ایک ممتاز شاعر تھا، اس کے بارہ میں میخانہ کا مؤلف رقمطراز ہے:

بعد از عرفی در استعارہ کردن کسے بہ از مرتکب این شیوہ نشدہ۔[۲]

سنجر نے بھی شہزادہ سلیم کے دربار میں باریابی حاصل کرکے اس کی ثنا خوانی کی، اس کے ایک قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں:

ہمیشہ لطف تو بر دشمنان شود مصروف	مدام جور تو بر دوستان بود جاری
زمانہ چند دل آزردن از تو آموزد	یکے ز شاہ بیاموز رسم دلداری
منت حلال کنم لیک بر نمی تابد	زمان شاہ سلیم این ہمہ ستمگاری[۳]

عرفی جب ہندوستان پہنچا تو شہزادہ سلیم نے بھی اس کے کلام کی شان و شوکت، استعارات کی طرفگی، بندش کی چستی، مضامین کی نازک خیالی، خیالات کی رفعت اور فقروں کے دروبست کی بڑی شہرت سنی، چنانچہ اس نے عرفی کو اپنے دربار میں بلا کر قصیدہ کہنے کی فرمایش کی، عرفی کی خودستائی اور خود بینی مشہور تھی، مگر اس دعوت پر اپنی خوش قسمتی کا اظہار کرتا ہے، چنانچہ جس وقت یہ پیام لیکر اس کے یہاں قاصد پہنچتا ہے، تو وہ گوہر افشانی کرتا ہے:

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم	گدا کلاہ نمد کج نہادو شہ دیہیم
جہان چنین خوش و من خوشتر از جہان وثاق	نشستہ با خرد انور تعلم و تعلیم

۱ بدایونی جلد سوم ص ۲۶۷، ۲ میخانہ ص ۲۴۹، ۳ خزانہ عامرہ، قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

که ناگهان ز درم در رسید مژده دهی — چنان که از چمن طالعم ز مغز نسیم
چه گفت؟ گفت که ای مخزن جواهر قدس — چه گفت؟ گفت که ای مطلب بهشت نعیم
بیا که از گهرت یاد می کند دریا — بیا که تشنه لبت را طلب کند تسنیم
ازین پیام دلم شد شگفته و شاداب — چناں که باغ ز شبنم چنانکه گل ز نسیم

عرفی ہمہ تن شوق بنکر اور بے تابی کے عالم میں دربار روانہ ہوا،

بره فتادم و گشتم چنان شتاب زده — که دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم

اور جب وہ دربار میں پہونچکر شہزادہ سلیم کے سامنے آیا، تو زمین بوس ہوا، مگر وہ لطیف پیرایہ میں کہتا ہے کہ اگر میں ادب سے رک نہ جاتا تو بجائے اس کے کہ میرے لب اس کے قدم چومتے اس کے قدم میرے لب کو چوم لیتے،

چو روزگار رسیدم به درگهی که کند — زمانه طوف حریمش به دیده تعظیم
رسیدن من و اقبال آں ہمایون فال — چناں فتاد مطابق در آن خجسته حریم
که اگر ادب نکشیدی عنان من قدمش — بوسه گاه همی کرد بر لبم تقدیم

شہزادہ سلیم اس کے ساتھ خاص لطف و کرم کے ساتھ پیش آیا جس کے بعد وہ آداب شاہی بجا لایا،

مرا چو دوش بدوش ادب بدید استاد — به لطف خاص بدل کرد التفات عمیم
زمونه کرنش و تسلیم را ادا کردم — به داب مردم دانا و بذله سنج ندیم

شہزادہ سلیم نے وقار و تمکنت میں عرفی کی طرف صرف نگاہیں اٹھائیں لیکن جب وہ عرفی سے مخاطب ہوا تو مغرور و خود بین شاعر نے محسوس کیا کہ اس کا سامعہ کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا،

بگفت و من بشنودم هر آنچه گفتنی داشت — که در بیان نگهش کرد بر زبان تقدیم

لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت — فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

شہزادے نے بلیغ پیرایہ میں عرفی کی تعریف کی اور پھر قصیدہ کی فرمایش کی،

نجندہ گفت کہ دہ عذر این گناہ بزرگ — کہ رفتہ نام تو بے حکم ما بہ سبقت اقلیم

ہمیں کہ رفتی ازین آستان نوشتہ بیار — گزیدہ نسخہ از زادہائے طبع سلیم

عرفی نے شہزادہ سلیم کی شان میں اور بھی قصیدے لکھے، دو کے مطلعے یہ ہیں،

دگر سفیر طبیعت بساز آگاہی — بعالم ملکوت است محملش راہی

نو بہار آمد کہ افشاند چو حسن یار گل — چون وصال عام ریزد ہر خس و ہر خار گل

عرفی کو عالم شباب ہی میں حاسدوں نے زہر دیدیا، اس لیے جہانگیر کی بادشاہت کے زمانے میں اس کی سرپرستی سے مستفید نہ ہو سکا، اس کے دیوان میں ۲۶ قصیدے، ۲۰۰ غزلیں، اور ان کے علاوہ بہت سے قطعات اور رباعیاں تھیں جنمیں ... شعر تھے، مخزن اسرار و شیرین خسرو کے جواب میں دو مثنویاں بھی لکھیں، ایک رسالہ نفسیہ نام سے فن تصوف میں تحریر کیا،

جہانگیر تخت پر جلوہ افروز ہوا، تو شاہی دربار باکمال شعراء سے بھرا ہوا تھا، جہانگیر نے جوہر شناسی سے کام لے کر **طالب آملی** کو ملک الشعراء کے عہدہ پر فائز کیا، طالب آمل کا رہنے والا تھا، جو مازندران کا ایک شہر ہے، سولہ برس کی عمر میں اس نے ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف اور خوشنویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا، تیموری حکمرانوں کی فیاضیوں کا شہرہ سنکر ہندوستان آیا، قندھار [illegible] کے یہاں ایک قصیدہ لکھکر حاضر ہوا، غازی خان نے بڑی گرمجوشی سے اس کی پذیرائی کی، اور ندیم خاص بنایا، غازی خان کی موت کے بعد خواجہ قاسم دیانت خان کے پاس آگرہ آیا، اور کچھ وقفہ کے بعد دیانت خاں نے جہانگیر کے دربار میں اس کی تقریب کی، مگر طالب جب جہانگیر کے حضور میں پہنچا تو کچھ ایسا مخمور اور مسحور ہو گیا کہ اس کی کسی بات کا جواب دے سکا،

دیانت خان کو بڑی ندامت ہوئی مگر طالب گھر پر آیا تو ۵ شعروں کا ایک قطعہ فی البدیہہ لکھکر دیانت خان کے پاس بطور معذرت بھیجا، اس کے بعد اعتماد الدولہ نے اس کو دربار میں پیش کیا، جہانگیر بہت لطف و محبت سے پیش آیا، رفتہ رفتہ سخن سنج اور سخن فہم بادشاہ طالب کی شاعری کی تشبیہات کی ندرت اور استعارات کی لطافت و نزاکت سے ایسا متاثر ہوا کہ اس کو دربار کا ملک الشعرا بنایا، جس کے بعد اس نے بڑی خوشحالی سے زندگی بسر کی، اس کا معاصر عبد النبی فخر الزمانی قزوینی مؤلف میخانہ رقمطراز ہے کہ

وزیر اعظم دار الامان مدار المہامی فرمانروائے ہندوستان اعتماد الدولۃ العلیہ العالیہ .... بعد از اندک ایامی خود باعث از دیاد رشد طالب گردید و او را داخل بساط بوسان محفل عظمت و شوکت بادشاہ جہان پناہ آسمان جاہ سلیمان دستگاہ شاہ نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ گردانید، آن منتخب نکتہ سنجان در اندک زمانی جوہر خویش بر فرمان روای دار الامان ہندوستان و شہریار جان بخش جہان ستان ظاہر ساخت تا در سنہ ثمان عشرین والف آن شہنشاہ گردون اساس و این بادشاہ جوہر شناس طالب را از امثال و اقران برگزیدہ بخطاب ملک الشعرائی سرفراز گردانید الحال بدولت این خسرو غریب دوست، مسکین نواز و این خورشید ذرہ پرور از ہمہ چیز بے نیاز سر آمد سخنوران و برگزیدہ نکتہ پروران است " (ص ۳۸۸)

جہانگیر ایک موقع پر طالب سے ناراض ہو گیا، طالب چند روز شرفیابی سے محروم کر دیا گیا، اس کا قصور معاف ہوا تو اس واقعہ کو ایک قصیدہ میں خاص شاعرانہ لطافت و بلاغت کے ساتھ ادا کرتا ہے، جہانگیر کے ساتھ طالب کو جو قلبی لگاؤ تھا، اس کا بھی اندازہ حسب ذیل اشعار سے ہوگا،

بہ نسبت گہرم دادہ بودی از کف خویش | تہ از جود زیانے چنین ہزار افتاد
چو رو شدم ز کفت چہ غم از ہوا بر بود | بہ گرمی کہ زبانم بہ نیمہا رافتاد
یکے مقابل خورشید داشت آئینہ ام | بدید کز عرقش موج بر عذار افتاد
چو پیش مشعل مہ بر و شب چراغ مرا | بچہرہ گونہ گاہیش شمع وار افتاد
ازیں نشاط مگر دست آسمان لرزید | کہ باز در کف خاقان کامگار افتاد
کنوں برشتہ مہرش بدار کز تقدیر | دو بار در کفت این در شاہوار افتاد[1]

نظیری نیشاپوری کو بھی جہانگیر نے شاہانہ الطاف و اکرام سے سرفراز کیا، اس کے بارے میں تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:

"در فن شعر و شاعری از مردم قرار دادہ بود" (ص ۹۲)

۵ھ جلوس شاہی میں جہانگیر نے اس کا شہرہ سنکر دربار میں طلب کیا، نظیری نے انوری کے اس قصیدہ پر

بازاین چہ جوانی وجمال ست جہاں را

ایک قصیدہ لکھکر پیش کیا۔ جہانگیر نے اس کے صلہ میں ہزار روپیہ، گھوڑا اور خلعت عطا کیا،[2]

جہانگیر نے ایک دفعہ نظیری سے ایک عمارت کے کتبہ کی فرمایش کی، اس نے ایک غزل لکھ کر پیش کی جس کا مطلع یہ تھا،

ایں خاک درت صندل سر گشتہ سران را | بادہ مژہ جاروب رہت تاجوران را

---

[1] منقول از شعر العجم حصہ سوم ص ۷۹-۱۸۰، [2] تزک جہانگیری (ص ۹۲)، شعر العجم حصہ سوم (ص ۱۳۹) میں نظیری کا قصیدہ ملاحظہ ہو۔

جہانگیر نے اس کے صلہ میں تین ہزار بیگھہ زمین انعام دی۔[1]

حیاتی گیلانی بھی جہانگیر کے دربار سے منسلک رہا، اس کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے، آخر عمر تک جہانگیر کے جود و کرم سے فیضیاب ہوتا رہا، جہانگیر اس کو ہمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رکھتا تھا، بہت ہی پرگو شاعر تھا، سات ہزار شعر اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، خسرو و شیریں کی بحر میں قصہ سلیمان و بلقیس لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا، جہانگیر نے خوش ہو کر اس کو سونے میں تلوا کر سونا انعام دیا۔[2]

مولانا شکیبی اصفہانی، یہ اپنے شیریں و رنگیں کلام کے لیے مشہور تھے، ہندوستان آئے تو کچھ دنوں عبد الرحیم خانخانان کے دربار میں رہے، پھر مہابت خان کی وساطت سے جہانگیر کے دربار میں پہنچے، اور ایک قصیدہ پیش کیا جس کے تین شعر یہ ہیں:—

فتادہ بر سرہم از ہجوم نقش جباہ　　بر آستان جہانگیر شاہ اکبر شاہ

چہ رفعتست تعالی اللہ آستانش را　　کہ از بلندی آن پہ بریخت مرغ نگاہ

زبسکہ ناصیۂ خویش سودہ اند ملک　　نگار خانۂ چین گشتہ خاک آن درگاہ

جہانگیر اس قصیدہ سے محظوظ ہو کر مولانا شکیبی سے لطف و کرم کے ساتھ پیش آیا، مولانا شکیبی کو توقع ہوئی کہ جہانگیر کے حضور میں ان کو روز باریابی ہوگی مگر کسی وجہ سے یہ توقع پوری نہیں ہوئی اسلئے کبیدہ خاطر ہو کر ایران واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا، جہانگیر کو جب ان کی اس کبیدگی کی خبر ملی، تو طلب کر کے کہا

مولانا شکیبی بایستی کہ از روزے چند بموجب تخلص خود شکیبیدئی نمی کبیدید۔

مولانا نے اس لطف خسروانہ کو ایک رباعی میں قلمبند کر کے بطور معذرت پیش کیا،

گفتی بشکیبی کہ زما کبیدی　　یعنی کہ نہ قبلۂ دعا کبیدی

حدیست حرا گو یم این بہتان است　　گویند بسگ کہ از وفا کبیدی

[1] تعمیر و آزاد
ص ۲۴
[2] میخانہ ص ۵۳۶

اس رباعی کو سنکر جہانگیر خوش ہوا، پھر مولانا شکیبی سے کہا کہ آپ کی ایک اور رباعی مجھکو بہت پسند آئی ہے جو میں نے اپنی بیاض میں اپنے ہاتھ سے لکھ لی ہے۔

نردیست جہان کہ بردنش باختن است نرّادی آن بداو کم ساختن است
دنیا بمثال کعبتین و نرد است برداشتنش برائے انداختن است

جہانگیر نے از راہ قدردانی مولانا کو دہلی کی صدارت پر فائز کیا، اور اسی شہر میں وہ آخر عمر تک رہے، شکیبی رفت (۱۰۲۲ھ) تاریخ وفات ہے، چار ہزار بیت کے ایک دیوان کے علاوہ ایک مثنوی خسرو شیریں بھی یادگار چھوڑی، (میخانہ ص ۲۳)

ملا لطفی تبریزی ہندوستان آئے تو جہانگیر ان کے کلام کی لطافت، دلآویزی اور رنگینی سے محظوظ ہوا، اور موزون الملک کے خطاب سے سرفراز کیا، اور ندیم خاص بنایا، کچھ دنوں کے بعد ان کو ٹھٹھ کے علاقہ میں بندر لہری کی حکومت تفویض کی، وہان تین سال رہ کر آگرہ واپس ہوئے، دوسری بار جہانگیر نے ان کو گجرات کے دار الضرب کا داروغہ بناکر بھیجا ۱۰۳۰ھ میں وفات پائی، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:-

(۱) هنوز جام شرابے بتو گلے نزدیم نوائے قہقہہ برصوت بلبلے نزدیم
ہزار فصل گل آرزو رسید و گذشت ہنوز بر سر یک آرزو گلے نزدیم

(۲) ہمین نہ کام من از روزگار تلخ شدہ است کہ زندگانیم از ہجر یار تلخ شدہ است
ز روزگار بود تلخکامی ہمہ کس ز تلخ کامی من روزگار تلخ شدہ است

(۳) یکچندپے گردش افلاک شدیم یکچندپے دانش و ادراک شدیم
از آمد و رفت خود ہمی نہ فہمیدیم خاک برآمدیم و در خاک شدیم[1]

[1] میخانہ ص ۴۹-۴۷-۵۰ و صبح گلشن ص ۳۵۵

مولانا علی احمد نشانی کا ذکر پہلے آچکا ہے، یہ صاحب فن، صاحب سخن اور صاحب دل بھی تھے، ایک بار جہانگیر کے حضور میں محفل سماع گرم تھی کہ ایک مطرب نے یہ بیت پڑھی

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے | من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

جہانگیر نے حاضرین سے اس بیت کا مطلب پوچھا، مولانا نشانی پر ایک وجد کی کیفیت طاری تھی، اسی عالم میں رقص کرتے اور تالیاں بجاتے ہوئے شاہی تخت کے پاس پہنچے، اور کہنے لگے۔ کہ ایک روز جمنا کے کنارے ہندو عورتیں اور مرد غسل کر رہے تھے، کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اپنی خانقاہ سے امیر خسرو کے ساتھ نکلے، دریا کے کنارے نظر اٹھائی تو یہ مصرع زبان مبارک سے نکلا،

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

امیر خسرو نے یہ مصرع سنا تو مرشد سے فی البدیہہ عرض کیا کہ

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہی

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سر مبارک پر اس وقت طاقیہ تھی، وہ تھوڑی سی کج تھی، مولانا نشانی نے اس بیت کی تشریح کرنے میں اپنی کلاہ کو کج کیا، اور وجد کی حالت میں بسمل کی طرح رقص کرتے ہوئے فرش پر گر پڑے، حاضرین کو خیال ہوا کہ مولانا بیہوش ہو گئے ہیں، جہانگیر اپنے استاد کی یہ کیفیت دیکھکر بے چین ہو گیا، غایت اضطراب میں تخت سے اتر کر مولانا کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا، اسی سکر میں مولانا کی روح مالک حقیقی سے جا ملی،[۱]

عطائی معنوی جونپوری۔ یہ شیخ عبد الکریم عطائی نام اور معنوی تخلص تھا، انشا و شعر میں اس کی قابلیت مسلم تھی، بعض امرا نے اس کو جہانگیر کے دربار میں پیش کیا، اس کی شاعری سے جہانگیر محظوظ

---

[۱] ریاض الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

ہو کر جونپور میں کچھ دن گیا پھر ہمت کی جس کے بعد معنوی نے خوشحالی سے زندگی بسر کی۔ اس کی ایک رباعی ہے:-

سودا بسرم ہمچو پلنگ اندر کوہ — غم بر سر غم بدل چو سنگ اندر کوہ
دور از وطن خویش بخواری گردم — چون شیر بدریا و نہنگ اندر کوہ[1]

حسن بیگ خاکی، جہانگیر اس کی ذہانت اور دقت نظر کا معترف تھا، شاہانہ نوازش سے سرفراز کر کے اس کو صوبہ بہار کا دیوان بنایا، وہاں اس نے ایک تاریخ عالم بھی لکھی، سنہ ۱۰۲۱ھ میں وفات پائی۔

عشق خوبان وفا کیش ندارد سودی — سر آن یار بگردم کہ جفا کیش بود[2]

حکیم عارف ایگی، نام سراج الدین حسن، تخلص عارف، اپنے وطن ایگ سے کرمان یزد، کرک اور سیستان ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا تو شہزادہ سلیم کی آستان بوسی کی، اور اس کی شان میں متعدد قصیدے کہے، پھر شہزادہ دانیال کے دربار سے وابستہ ہو گیا، جہاں اس کے اچھے نہیں گذرے، اکبر کا بھی پانچ سال تک وظیفہ خوار رہا، پھر وطن چلا گیا، وہاں سے پانچ سال کے بعد واپس آیا تو کچھ دنوں ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کے بعد اعتماد الدولہ کے وسیلہ سے پھر جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا، جہانگیر نے شاہانہ لطف و کرم سے نوازا، اور صوبہ بہار میں پانچ سو بیگہ زمین گذران اوقات کے لیے عطا کی، عارف نے جذبۂ تشکر میں ایک قطعہ کہا جس کے دو شعر یہ ہیں:

خدایا تو این شاہ درویش دوست — کہ آسایش خلق در ظل اوست
برآرش بر اورنگ شاہی و جاہ — بر اوج فلک تا بود مہر و ماہ

---

[1] میخانہ ص ۵۵۳، [2] ریاض الشعراء

وہ ایک کتاب اندرزنامہ کا مصنف بھی تھا، جس میں شاہنامہ کی بحر میں دو ہزار تین سو اشعار تھے، ایک ساقی نامہ میخانہ میں منقول ہے،[۱] اس کے ایک قصیدہ کا ذکر پہلے آچکا ہے،

شیدا۔ قبیلہ تکلو سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے شیدائے تکلو کے نام سے مشہور ہوا، اس کا خاندان مشہد سے ہندوستان آیا، شیدا کی پیدایش فتح پور (آگرہ) میں ہوئی، اس لیے ایرانی شعرا اس کو ہندوستانی سمجھتے تھے، جہانگیر کے لشکر میں احدی کی حیثیت سے مامور ہوا، اور دستور کے مطابق اس کو جاگیر اور علوفہ ملتا تھا، دکن کی تسخیر کے سلسلہ میں اس نے عبدالرحیم خانخاناں کی شان میں بھی انوری کے طرز پر قصیدہ کہا، جو مآثر رحیمی جلد سوم (ص ۱۴۸۹) میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے، کچھ دنوں شہزادہ شہریار کی ملازمت میں بھی رہا اور آخر میں شاہجہان کے دربار سے وابستہ ہوا، بہت ہی ذہین، پرگو اور ذی علم شاعر تھا، مگر تمام شعرا اس کی خردہ گیری، عیب جوئی اور ہجوگوئی سے عاجز تھے، حتیٰ کہ ملک الشعراء طالب آملی کو بھی اپنے طنز و استہزاء سے نخچیر کیا،

شب و روز مخدوم ما طالبا — پئے جیفہ دنیوی در تگ است

مگر قول پیغمبر آمد بجا — کہ دنیا است مردار طالب سگ است[۲]

ارباب سخن شیدا کو زیر کرنے کی فکر میں رہتے، مگر شاید ایک ہی موقع ایسا آیا جب کہ وہ ان سے پسپا ہوا، اس کی دلچسپ تفصیل سے ہم ناظرین کو بھی محظوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ۱۰۲۳ھ میں جہانگیر اجمیر گیا، لشکر کے ساتھ شاہی جلو میں شعرا بھی تھے، ایک روز شیخ فیروز کی قیامگاہ پر تمام اصحاب سخن مثلاً طالب آملی، ملا عطائی جونپوری، انور لاہوری، طفیلی فتحپوری وغیرہ جمع ہوئے، شیخ فیروز کو مقبولیت اس لیے حاصل تھی کہ اس کو اساتذہ کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے، یہ مجلس جاری تھی کہ شیدا بھی آپہنچا، تمام شعرا نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم

---

[۱] ص ۲۲۰-۲۰۴۔ [۲] ید بیضا قلمی نسخہ ص ۶۲،

کیا، اور نمایاں جگہ پر بٹھا کر اس سے تازہ کلام سنانے کی فرمایش کی، شیدا نے یہ شعر پڑھا،

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے　　حسن را پروردگا عشق را پیغمبرے

شیخ فیروز نے کہا یہ تو رودکی کے شعر سے سرقہ ہے،

عشق را پیمبر ولیکن　　حسن را آفریدگار توئی

شیدا کچھ برہم ہوا لیکن اس نے ایک دوسرا شعر سنایا،

زبسکہ کرد غمت بتدبیر جگر ناخن　　چو پشت ماہیم از پاے تا بسر ناخن

شیخ فیروز نے اعتراض کیا کہ یہ غیاثا ی حلوائی کا چربہ ہے،

از بسکہ سینہ کندم ناخن درد نشست　　چو پشت ماہیست سراپاے سینہ ام

شیدا اور بھی زیادہ چین بجبین ہوا، مگر ایک اور شعر پڑھکر داد چاہی،

بصحرا موفشانی دشت پر سنبل شود　　ور بدریا رو بشوی خار ماہی گل شود

مگر شیخ فیروز بولا کہ یہ تو ملا کاہی کے شعر سے توارد ہے،

گر بدریا افتد از عکس جمال او فروغ　　خار ماہی آورد در قعر دریا بار گل

شیدا نے چڑھ کر کہا کہ اگر یہی تم ظریفی ہے تو اس کے مقابلہ کا شعر سناؤ،

ذات تو بود صحیفہ کون کہ کرد　　از روی ادب مہر خدا بر پشت

شیخ فیروز نے فوراً ہی ہاتفی کا شعر پیش کیا،

نبوت را توی آن نامہ درشت　　کہ از تعظیمش آید مہر بر پشت

حاضرین نے قہقہہ لگایا، شیدا نے زچ ہوکر بدکلامی شروع کردی لیکن اصحاب مجلس بر

پھر مصر ہوئے تو اس نے یہ شعر پڑھا،

زلف او را رشتہ جان گفتم و گشتم خجل　　زانکہ این معنی جز لغزش پیش پا افتادہ است

شیخ فیروز نے کہا کہ مہمان کی دلآزاری مراد نہیں، لیکن اس مضمون کا ایک شعر پہلے بھی کہا جا چکا ہے:

کس نیابد مصرعہ پیچیدۂ زلف کجت　　گرچہ این مضمون ترا در پیش پا افتادہ است

اسی طرح شیدا نے کچھ اور شعر سنائے، تو شیخ فیروز اس کے ہر شعر کا ماخذ بتاتا گیا، بالآخر شیدا پر مہر سکوت لگ گئی، اور باوجود اصرار کے اس نے کوئی اور شعر پڑھنے کی ہمت نہ کی، اور پھر کبھی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوا جس میں شیخ فیروز بھی ہوتا، مگر شیخ فیروز کا بیان ہے کہ کشمیر میں ایک روز شیدا اس کے گھر پر آیا، اور پوچھا کہ میرا کوئی شعر بھی قابل ستایش ہے تو فیروز نے کہا ہاں اور وہ شعر یہ ہے:

اے بروے تو کز و آئینہ را چشم نیاز　　شانہ را دست دعا در شب زلف تو دراز

شیدا نے ہاتھ پھیلا کر دعا کی "عمرت دراز باد"[۱] شیدا کا ذکر شاہجہان کے سلسلہ میں بھی آئے گا،

فضلاء | جہانگیر کی قدر دانیوں کے سبب اس کے دربار میں علما بھی بکثرت تھے ہم ان میں سے دو چار کا ذکر کرتے ہیں،

میران صدر جہان پہانی۔ پہلے ذکر آچکا ہے، کہ جہانگیر نے شہزادگی کے زمانہ میں ان سے چہل حدیث پڑھی تھی، مآثر الامرا، جلد سوم (ص ۳۴۸) میں ہے،

"مرد فاضل خوش طبع بود"

اکبر کے زمانہ میں ممالک محروسہ کے صدر تھے، حکیم ہمام کے ساتھ عبداللہ خان ازبک والئی توران کے پاس ایلچی بنا کر بھی بھیجے گئے، وہاں علماء سے بڑے معرکے ہوئے، ہر فن میں صدر جہان ان پر غالب رہے، جس سے وہاں کے ارباب علم کو بڑی حیرت ہوئی، وہاں سے واپس ہوئے تو کچھ دنوں کیلئے صدارت کل کی خدمت تفویض کی گئی، اور منصب دو ہزاری بھی عطا ہوا، جہانگیر انکا

---

[۱] مخزن الغرائب قلمی نسخہ، دار المصنفین ورق ۲۱۶ - ۲۱۵

بڑا فدر دان تھا، شہزادگی کے زمانہ میں اس کو معلوم ہوا کہ صدر جہاں مقروض ہیں، تو اس نے وعدہ کیا کہ تخت وتاج کا مالک ہوا تو وہ ان کا سارا قرض ادا کر دیگا، اور ان کی خواہش کے مطابق منصب پیش کریگا، چنانچہ ایسا ہی کیا، چار ہزاری منصب دے کر قنوج کا علاقہ تنخواہ میں عطا کیا، صدر جہان نے جہانگیر کی نوازشوں سے فائدہ اٹھا کر خلق اللہ کی بڑی خدمت کی، اور ان کی مدد معاش کے سلسلہ میں بڑی فیاضی دکھائی، چنانچہ آصف خان جعفر نے جہانگیر سے عرض کیا کہ عرش آشیانی (یعنی اکبر) نے جو بخشش پچاس سال میں کی تھی صدر جہاں نے پانچ سال کی صدارت میں کی۔ (مآثر الامرا، جلد سوم ص ۳۵۰، ومآثر الکرام جلد دوم ص ۹۳)

مولانا مرزا شکر اللہ شیرازی۔ شیراز، قزوین، عراق اور عرب سے علوم متداولہ حاصل کر کے ہندوستان آئے، نسخ، تعلیق اور علم سیاق میں مہارت تامہ رکھتے تھے، پہلے عبدالرحیم خانخانان کی فیاضیوں سے متمتع ہوئے، پھر جہانگیر کی ملازمت میں آئے، جہانگیر نے انھیں شہزادہ خرم کی ماتحتی میں عہدۂ دیوانی پر مامور کیا، اپنے فرائض منصبی میں بہت کامیاب رہے، پھر اودے پور کی مہم میں کچھ مفید خدمات انجام دینے پر جہانگیر نے ۱۰۲۴ھ میں انھیں افضل خاں کے خطاب سے مشرف کیا، اور اجمیر کا ناظم بنا کر بھیجا،[۱]

مولانا تقیای شوستری۔ شیراز سے تعلیم کی تکمیل کر کے ہندوستان آئے، ان کے بارے میں مآثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے،

"مولانا تقیای شوستری طالب علمے بے مثال وقرین دمنشی وشاعر سے سخن آفرین است در اقسام منظومات عیوری تخلص می فرماید"

جہانگیر نے انھیں صدارت کے منصب سے سرفراز کیا،[۲]

---

[۱] مآثر رحیمی حصہ سوم ص ۰۰ [۲] ایضاً ص ۶۶۲،

"الحق محنت بسیار کشیدہ، خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علمار قدما استشہاد آوردہ

درین فن کتابے مثل ایں نمی باشد"[1]

مولانا شبلی جہانگیر کی اس رائے کی نسبت لکھتے ہیں کہ "فارسی کا ایک محقق اس کتاب کی نسبت اس سے بڑھ کر کیا رائے دے سکتا ہے، فارسی لغت میں جس قدر کتابیں اس وقت تک لکھی گئی تھیں، کسی میں قدماء کے اشعار سے سند لانے کا التزام نہ تھا، اور فرہنگ جہانگیری کا یہی امتیازی وصف ہے"[2]

وہ ہندو پنڈتوں اور درویشوں سے اسی فراخدلی اور عقیدتمندی سے ملتا جس طرح علمائے اسلام سے پیش آتا تھا، ۱۲ جلوس میں جب اوجین گیا، تو اسے معلوم ہوا کہ سنیاسی مرتاض جدروپ نامی دنیا سے کنارہ کش ہو کر ایک دشوار گذار بھٹ میں رہتا ہے، جس کا طول ساڑھے پانچ گرہ اور عرض ساڑھے تین گرہ تھا، یہ اس قدر تنگ تھا کہ اس میں مشکل سے ایک شیر خوار بچہ سما سکتا تھا، جہانگیر کو اس سے ملنے کا شوق پیدا ہوا، وہاں تک سواری پہنچ نہ سکتی تھی، مگر وہ تین میل پاپیادہ چل کر وہاں پہنچا، اور چھ گھڑی اس کی صحبت میں رہا، اس ملاقات کی نسبت لکھتا ہے:

"الحق کہ وجودش بغایت مغتنم است، در مجلس او محظوظ و مستفید می توان شد، علم بیدانت را کہ علم تصوف باشد، خوب ورزیدہ، تا شش گھڑی با او صحبت داشتم، سخنان خوب کردہ ساخت چنانچہ خیلے در من اثر کرد"

اس ملاقات سے وہ سیر نہیں ہوا، پھر گیا، چنانچہ لکھتا ہے:

"باز خاطر را بملاقات گسائیں جدروپ رغبت افزود، بے تکلفانہ بکلبۂ او شتافتہ صحبت

---

[1] تزک جہانگیری ص ۲۰۶۔ [2] مقالات شبلی ج ۴ ص ۱۱۳

مولانا مرزا محمد قاسم گیلانی - حدیث اور فقہ کے متبحر عالم تھے، قزوین اور اصفہان میں کچھ دنوں رہنے کے بعد ہندوستان آئے، تو پہلے بیجاپور میں دربار عادل شاہی سے وابستہ رہے، سنہ ۱۰۲۴ھ میں برہانپور خاندیس میں شہزادہ پرویز سے ملے، جس نے ان کی بڑی پذیرائی کی، عبدالرحیم خانخاناں نے بھی اپنے دربار میں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا، اور نقد جواہرات کے علاوہ بہت سی اور چیزیں بھی ان کی خدمت میں پیش کیں، اور اسی کی وساطت سے جہانگیر کے دربار میں ملازم ہوئے، جہانگیر ان کا سرپرست اور قدردان رہا[1]

جہانگیر کے عہد کے دوسرے علماء کے نام جو مصنف اقبال نامۂ جہانگیری نے بتائے ہیں، یہ ہیں

ملا آروز بہان شیرازی، ائمی اعمری، ملا باقر کشمیری، ملا باقر ٹھٹھی، ملا مقصود علی تبریزی، قاضی نوراللہ، ملا فاضل کابلی، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا عبدالمطلب سلطانپوری، ملا عبدالرحمٰن بوہرہ گجراتی، ملا حسن فراغی گجراتی، خواجہ عثمان حصاری، اور ملا محمد جونپوری،[2]

جہانگیر ہر مذہب وملت کے علماء سے بہت بے تکلفی کے ساتھ ملتا تھا، اور ان کے متعلق جو رائے ظاہر کرتا تھا، وہ بڑی محققانہ ہوتی تھی، یہ شیخ عبدالحق دہلوی سے ملا، تو لکھتا ہے:

"مدت ہاست کہ در گوشۂ دہلی بہ وضع توکل و تجرید بسر می برد، مرد گرامی ست صحبتش بے ذوق نیست، بہ انواع مراحم دلنوازی کردہ رخصت فرمودم"

ان کی تصنیف تذکرۂ اولیائے ہند کے بارے میں رائے ظاہر کرتا ہے:-

کتابے تصنیف نمودہ بود، مشتمل بر احوال مشائخ ہند بہ نظر درآمدہ خیلے زحمت کشیدہ،[3]

میر عضدالدولہ نے جب فرہنگ جہانگیری پیش کی، تو اس کے متعلق جہانگیر لکھتا ہے:

---

[1] مآثر رحیمی حصہ دوم ص ۳۹، [2] اقبال نامۂ جہانگیری ص ۳۰۰، [3] تزک جہانگیری ص ۲۸۴،

داشتہ شد، سخنان بلند درمیان آمد حق جل و علیٰ غریب توفیقے کرامت فرمودہ فہم عالی فطرت بلند و مدرکہ تند را با دانش خدادادہ جمع و دل آزاد ساختہ پشت پا بر عالم و مافیہا زدہ در گوشۂ تجرید مستغنی و بے نیاز نشستہ۔"

اوجین سے رخصت ہوتے وقت اس کے پاس پھر ملاقات کو گیا، الوداعی ملاقات اس پر شاق گذری، لکھتا ہے:

"باز بملاقات گسائیں رفتہ از وداع شدم، بے تکلف جدائی از صحبتِ او بر خاطر حقیقت گزیں گرانی نمود۔"[۱]

آخر عمر میں جہانگیر کو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کیمیا اثر سے غیر معمولی روحانی اور مذہبی فیوض و برکات حاصل ہوئے، پہلے تو بعض درباری امرا کی فتنہ سامانیوں اور شر انگیزیوں سے حضرت مجدد اعظم سے برگشتہ رہا، حتیٰ کہ مشتعل ہو کر ان کو گوالیار میں محبوس کر دیا، مگر عاشق شریعت رسول کی قید و بند کے زمانہ میں ایک روز جہانگیر نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فرما رہے ہیں کہ تم نے ایک بڑے آدمی کو قید کر دیا ہے، جہانگیر نے منفعل ہو کر حضرت شیخ احمد قدس سرہ کی رہائی کا حکم صادر کیا، اور اپنے پاس بلا کر معذرت کی، اور لطف و کرم سے پیش آیا، ان کی ذات اقدس سے جہانگیر کی شیفتگی اور عقیدت اتنی بڑھی کہ اپنے کو زیادہ تر ان ہی کی خدمت بابرکت میں دیکھنا چاہتا تھا، خزینۃ الاصفیا میں ہے:

"بادشاہ (جہانگیر) از محبان شیخ شد، بحدیکہ گاہی آنجناب را از خود جدا نمی کرد، و شاہزادہ خرم را داخل حلقہ مریدان شیخ نمود، چنانچہ تا عہد شاہجہان و عالمگیر بادشاہان باہمہ علما و وزرا، داخل سلسلہ مجددیہ می شدند،" (حصہ اول ص ۶۱۳)

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۲۸۳

روزانہ مغرب کے بعد جہانگیر حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ سے ملاقات کرتا، ان ملاقاتون مین حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے سرچشمۂ علم وفضل سے اس کے قلب کی جس طرح تطہیر ہوئی وہ خود ان کے مکتوب میں سننے کے قابل ہے، وہ اپنے صاحبزادون خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو تحریر فرماتے ہیں:

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اس طرف کے احوال اور اوضاع حمد کے لائق ہیں، (بادشاہ کے ساتھ) عجیب وغریب صحبتیں گزر رہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ میں سرمو سستی اور مداہنت دخل نہیں پاتی، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلون مین بھی وہی باتین ہوتی ہین جو خاص خلوتون اور مجلسون مین بیان ہوا کرتی ہین، اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے، خاصکر آج ماہ رمضان کی سترہوین رات کو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب وثواب اور رویت ودیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسل کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اقتدا، اور تراویح کے سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور جن اور جنیون کے احوال اور ان کے عذاب وثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا، اور (بادشاہ) بڑی خوشی سے [illegible] اس اثنا مین اور بھی بہت سی چیزون کا ذکر [illegible] اقطاب، اوتاد، ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتون وغیرہ کا ذکر ہوا، اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ (بادشاہ) سب کچھ قبول کرتے رہے، اور کوئی ایسا تغیر ظاہر نہ ہوا جو بے ہمی پر دلالت کرے، ان واقعات اور ملاقات مین شاید اللہ تعالیٰ کی پوشیدہ حکمت اور راز خفیہ ہوگا۔ الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت

رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ، دوسرے یہ کہ قرآن مجید کو (بادشاہ سے) سورہ عنکبوت تک ختم کرا چکا ہون۔
جب رات کو اس مجلس (یعنی شاہی مجلس) سے اٹھ کر آتا ہون تو تراویح مین مشغول ہوتا ہون، حفظ قرآن مجید کی یہ اعلیٰ دولت اس پراگندہ حالی میں جو عین جمعیت ہے حاصل ہوئی ہے الحمدللہ اولاً و آخراً، (مکتوبات امام ربانی، دفتر سوم، نمبر ۴۳)

جہانگیر کے اس تزکیۂ باطن کے بعد حضرت مجدد اعظمؒ نے اسلامی شریعت کی فلاح و بہبود کے لیے جو چاہا اس سے کرایا،

مشہور ہے کہ جہانگیر اکثر کہتا تھا کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت شیخ کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے،

جہانگیر اور کتب خانہ و مدارس جہانگیر ایک شاندار کتب خانہ کا مالک تھا، مکتوب خان اس کا مہتمم تھا، جب وہ سفر میں جاتا تو بھی ایک کتب خانہ ساتھ لیجاتا تھا چنانچہ تزک میں ہے کہ جب وہ گجرات پہنچا تو وہاں کے مشائخ کو اپنے کتب خانہ سے تفسیر حسینی، تفسیر کاشفی اور روضۃ الاحباب نذر کین، اس نے مدارس کی تعمیر کا یہ اہتمام رکھا تھا، کہ جب کوئی امیر یا متمول مسافر لاوارث مرجاتا، تو اس کے مال و متاع سے مدارس اور خانقاہیں بنواتا تھا[۱]، تاریخ خان جہان میں ہے کہ اس نے ان تمام مدارس کو از سر نو آباد کیا، جو گذشتہ تیس سالوں سے پرندوں اور چوپایوں کے مسکن بنے ہوئے تھے،[۲]

---

[۱] منتخب اللباب خافی خان [۲] تاریخ خان جہان بحوالہ پرموشن آف محمڈن لرننگ ص ۱۷۵

شاہجہان

شاہجہان کی نادرہ کار تعمیری یادگارین اس کے ذوق کی نفاست اور لطافت کی بیّن دلیل ہین۔ اس کی تمام تکوینی قوتین فنونِ لطیفہ کی اسی شاخ پر صرف ہوئین۔ اگر ہم بابر کی ذہنی نقش آرائیان اس کی تزک بابری ہین۔ ہمایون کی تخییل آرائیان اس کے شعروشاعری ہین اکبر کی علمی فیاضیان اس کے دربار کی ہنرپرور فضا ہین۔ اور جہانگیر کی رنگینیان اس کی تزک جہانگیری میں پاتے ہین، تو شاہجہان کے ذہن کی پرکاریان اس کے تختِ طاؤس، قلعہ معلّی اور روضۂ تاج کے نقش ونگار سے عیان ہین۔ اس لیے یہ امر موجب تعجب نہین گر اس نے اپنے باپ یا اپنے لڑکون دارا اور اورنگ زیب کی طرح کوئی علمی یادگار نہین چھوڑی۔ اس کے دماغ کی گل افشانی سفینہ کے صفحات کے بجائے دیوان خاص اور دیوان عام کی دیوارون پر ہوئی۔ اس کا حسن ذوق علم وادب کے بجائے جامع مسجد دہلی کی تعمیری ندرت ونفاست مین ظاہر ہوا۔ اس نے محبت کا ترانہ شعر وشاعری مین نہین بلکہ تاج مین منظوم کیا۔

اس کو بابر، ہمایون اور جہانگیر کی طرح علمی انہماک نہ تھا۔ اس لیے ان کی طرح کوئی علمی تصنیف نہین چھوڑی، لیکن پھر بھی اس کی کتاب زندگی کا کوئی صفحہ علمی دلچسپیون سے خالی نہین۔ اس کے دربار کی علمی فضا اور اہلِ علم وفن کیساتھ اس کی عدیم المثال فیاضیان اور زرپاشیان، پھر دارا شکوہ، جہان آرا، مراد، اور اورنگ زیب کی اعلیٰ تعلیم وتربیت اس کے ذوق سلیم کی شہادت دیتے ہین۔

وہ جب چار برس، چار مہینے اور چار روز کا ہوا، تو خاندانی روایات کے مطابق پڑھنے

کے لیے بٹھایا گیا، قاسم بیگ تبریزی، حکیم دوائی گیلانی، شیخ ابوالخیر (برادر علامی ابوالفضل) اور وجیہ الدین گجراتی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے، ان باکمال استادون کی زیرنگرانی شہزادہ خرم نے علوم وفنون کی تکمیل کی، خطاطی مین اس کو بڑی مہارت تھی، محمد صالح کنبوہ لاہوری شاہجہان کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں لکھتا ہے:-

"بسے برنیامد کہ بتفصیل تحصیل فصول ابواب دانش نمودہ در جمیع فنون فضائل دقایق نکتہ فہمی را باعلیٰ درجات کمال رسانید، و درعرض اندک مایہ مدتے بے آنکہ کار بطول کشد، ہیولائے خط نیز صورت درست پذیرفتہ تختہ مشق از ریختہ قلم مشکین رقمش چون صفحۂ رخسارۂ نوخطان بحسن خط زینت گرفت"[1]

ان استادون مین دوائی گیلانی کی سعی ومحنت زیادہ بارآور تھی، چنانچہ شاہجہان کہا کرتا تھا:-

"فی الحقیقت حکیم دوائی آموزگار ماست، وحق تعلیم او بر ما از استادان دیگر بیش است"[2]

تاتار خان جس کو ترکی لغت کی واقفیت مین اعلیٰ کمال حاصل تھا، شہزادہ کی ترکی زبان کی تعلیم کے لیے مامور تھا[3]، یون تو اس نے شروع ہی سے اکبر کی سب سے پہلی بیوی خدیجۃ الزمانی رقیہ سلطان بیگم بنت ہندال مرزا کی نگرانی مین پرورش پائی[4]، جو خالص ترکی زبان بولا کرتی تھی، مگر شاہجہان کو ترکی بولنے کی کبھی مشق نہین ہوئی، جہانگیر کہا کرتا تھا، "کہ اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ خرم مین کیا عیب ہے تو مین کہونگا کہ وہ ترکی زبان نہین جانتا ہے"[5]، وہ ہندوستانی زبان سے بھی واقف تھا،

شاہجہان نے کوئی تصنیف اور نہ رقعات کا مجموعہ چھوڑا، اس لیے اس کی علمی لیاقت کا اندازہ کرنا

۱؎ عمل صالح موسوم بہ شاہجہان نامہ از محمد صالح کنبوہ جلد اول ص ۳۱ ۲؎ ایضاً ص ۳۲ ۳؎ ایضاً ص ۳۳،
۴؎ بادشاہنامہ از عبدالحمید لاہوری جلد اول ص ۶۲ ۵؎ تزک جہانگیری،

مشکل ہے لیکن شاہجہان نامہ میں اس کا ایک رقعہ منقول ہے جو اس نے تخت نشینی کے بعد دست

خاص سے لکھ کر آصف خان یمین الدولہ کے پاس بھیجا۔ ترجمہ حسب ذیل ہے:

"دانائے رموز سلطنت عظمیٰ، واقف اسرار خلافت کبریٰ، سرخیل یکرنگان وفادار، سلالۂ محبتان حق گذار، کارفرمائے سیف و قلم، مدبر امور عالم، زبدۂ خواتین عالیشان، قدوۂ امرائے بلند مکان، عضد الخلافت یمین الدولہ، عموی وزرا آصف خان، در امان حضرت ملک منان بوده بدانند که در چهارم گھڑی روز مبارک دوشنبه بست و ہفتم ماه بہمن موافق ہشتم جمادی الثانی سنہ ہزار و سی و ہفت ہجری بمبارکی و فیروزی در دار الخلافت اکبرآباد جلوس میمنت مانوس بر تخت سلطنت و سریر خلافت واقع شد، و بدستوری که معروض داشته بودند لقب را شہاب الدین قرار دادیم، چنانچه نام مبارک را بعنوان اقبال نشان صاحبقران ثانی شاہجہان بادشاه غازی در خطبه که درین روز بلند آوازه گردانیدند درج نمودند که هم بهمین نام مبارک زده شد،

الله الحمد که آن نقش که خاطر میخواست

آمد آخر ز پس پردۂ تقدیر برون

امیدواریم که حق تعالیٰ این بادشاہی کل منتقل بشتشن را که محض کرم خود با عنایت نموده بر بر ما و شما که شریک غالب این دولت ابد مبارک گرداند، و روز بروز فتوحات تازه و نصرت ہائے بے اندازه نصیب ما شود و شما ہم بعمر طبیعی رسیده از دولت ما دولت ہائے عظیم یابید۔ خدمت پرستان آخر روز جمعه رسید و حرف داشت شما را گذرانید و معروض

لہ بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری ج ۱ ص ...

ے شاہجہان نامہ از محمد صالح کنبوہ، بادشاہ نامہ جلد اول از عبدالحمید لاہوری، شاہجہان کے بعض اور رقعات بھی نظر سے گذرے لیکن علمی حیثیت سے وہ قابل نہیں ہیں۔

رسانید، کہ مقرر نمودہ آمد، کہ روز پنجشنبہ بیست وکیم ماہ بہمن از آنجا روانہ شوید و روز جمعہ چہاردہم ماہ اسفندار بملازمت ما مشرف گردید، این معنی چون دلالت بران می نمود کہ زمان دریافت ملازمت نزدیک رسید خوشحال شدیم. قرار داد این معنی کہ پادشاہزادہای کامگار برخوردار را ہمراہ بیاورید، وخواجہ ابوالحسن را در لاہور بگذارید مستحسن افتاد، سروپائی کہ در روز مبارک جلوس میمنت مانوس پوشیدہ بودیم برائے آن عمدۃ الخلافہ فرستادیم، ہرچند کہ ہرچہ بآن عمو عنایت فرمائیم زیادہ از آن گنجائش دارد، اما بالفعل منصب ہشت ہزاری ذات وہشت ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عنایت نمودیم. وسوائے آن بندہ لاہری را بطریق انعام مرحمت فرمودیم، این عنایت ہائے بار شما مبارک باشد''

اس عبارت مین نہ جہانگیر کی تزک کی رنگینی اور روانی ہے، نہ عالمگیر کے رقعات کی سلاست و برجستگی؛ لیکن پھر بھی اس کا کاتب کوئی معمولی استعداد کا آدمی نہین معلوم ہوتا.

ایک اور فرمان سے اس کی علمی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے، ایک بار کا ذکر ہے کہ شاہجہانی سفر اعراق گئے، تو وہان کے ایک وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ مین قدم علم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے مسئلہ مین شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے. اس کا جواب کیا ہے؟ شاہجہانی سفرا ہندوستان اور سلطنت تیموریہ کے علمی ... وقار کو قائم رکھنا ضروری سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے شاہجہان کو اطلاع کی شاہجہان نے اپنے وزیر نواب سعد اللہ خان کو حکم دیا کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو لکھو کہ اس کے متعلق دس پندرہ دن مین ایک رسالہ لکھکر پیش کرین تاکہ عراق بھیجا جائے، چنانچہ سعد اللہ خان نے ایک فرمان صادر کیا، جس مین لکھا کہ

''کمترین مریدان حکم محمد آن فضائل وکمالات دستگاہ سطرے چند بنگارد دبرآن

آرد کہ ان افادت وافاضیت مرتبت را درین مسائل مختصر جامع مفیدے کہ مستجمع کلمات
حکمات حکما وتاویلات علما و وجہ تکفیر اسلامیین واقوال لمیین، ومباحثات ومناظرات
وشکوک وشبہات وازالات واخراجات واسولہ واجوبہ وغایت تدقیقات ونہایت
تحقیقات واصل کلام درہر باب واساس سخن درہر جواب وآن چہ دران ظفر یافتہ باشد
وبرہان بران فائدہ شدہ باشد، واحاطۂ مسائل متعلقہ بمطلب علم از حصولی وحضوری
بودن وعلم وعین عالم وعین معلوم است، یا غیر، وتعلق آن بجزئیات بوجہ کلی است یا بوجہ
جزئی، وتحریر آنکہ کلیہ وجزئیہ معلوم تابع مدرک ویا تابع مدرک است ونسبۃ الواجب جزئی
ست یا نہ، وبیان آنکہ ادراک تعلقی است، نہ احساسی........ الخ"

ایک صاحب نظر کا خیال ہے کہ یہ جملے شاہجہان کے بنائے ہوئے تھے، چنانچہ عبارت ہذا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "شاہجہان کی علمی قابلیت کا یہ نمونہ ہے، کہ اس نے اس مسئلہ مین جن امور پر رسالہ لکھوانا چاہا ہے، اس کو چند جملون مین ادا کر دیا"، آگے چل کر پھر لکھتے ہیں کہ "سعد اللہ خان کی علمی استعداد تو مشہور ہی ہے لیکن شاہجہان کی علمی فضیلت بھی اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ کچھ کم نہ تھی، ظاہر ہے کہ جو شخص کسی علم وفن سے واقف نہ ہو وہ کیا اس کو سمجھ سکتا ہے"[1]

شاہجہان کی علمی لیاقت کا حال ان حکیمانہ اور عالمانہ باتون سے بھی معلوم ہوتا ہے، جو وہ اپنے درباریوں سے کہا کرتا تھا، عمل صالح جلد اول (ص ۵۱۴-۵۱۵) مین ہے:

ماہ آذر کی چوتھی تاریخ کو بادشاہ کی محفل مین ہر ملک کے علماء جمع تھے، اور شرکاء اپنے اپنے مبلغ علم کے مطابق ہر فن کے تمام مسائل کے متعلق گفتگو کرتے تھے، بادشاہ جو نہایت حکیم اور محقق تھا، ہر مسئلہ مین دخل دیتا تھا، اور ہر قسم کی گفتگو کرتا تھا، یہان تک کہ سلسلۂ سخن ان بادشاہون اور حکماء تک پہنچا جو بادشاہ بھی تھے اور حکیم بھی تھے، اسی

[1] معارف، نمبر ۲ جلد ۱۰،

اثنا رین یمین الدولہ سکندر کی تعریف اس حد تک کی کہ اتنی طویل مدت مین عقلمندون کے کسی فرد نے اس بادشاہ کے کسی قول وفعل سے گرفت نہیں کی، بادشاہ نے فرمایا کہ چونکہ سکندر فیلقوس رومی کی نبوت ثبوت کے درجہ تک نہین پہونچی ہے، اور محققین ائمہ تاریخ کے قول کے مطابق اسکندر ذوالقرنین دوسرا شخص ہے، اس لیے مجھکو ادب کے ساتھ اس کے قول وفعل پر دو اعتراض ہیں پہلا یہ کہ دارا کے قاصد کے جواب مین جب اس نے سونے کے وہ انڈے مانگے تھے جن کو اس کا باپ فیلقوس ہر سال بطور خراج دیتا تھا تو اس نے کہا کہ

شد آن مرغ کو خایۂ زرین نہاد

اس قسم کی بات اپنے باپ کے متعلق کہنا نہایت بے ادبی ہے، کیونکہ مرغیان نہایت حقیر جانور ہین اور اسی کے ساتھ انڈا دینا ان کی نسوانیت کو مستلزم ہے، دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس قاصد کے لباس مین خود شاہ کی مجلس مین جانا دور اندیشی اور احتیاط کے خلاف تھا، اور یہ طریقہ عقلمندون کے طریقہ سے الگ ہے، کیونکہ عقلمند ایسا کام نہین کرتے جس سے ان کو پسپائی ہو، حاضرین مجلس نے ان باتون سے اتفاق کیا،

ایک دوسری مجلس کا تذکرہ بھی ملاحظہ ہو:—

مہینے کی انیسوین تاریخ کو جبکہ تمام حکما، و شعرا دربار مین حاضر تھے، ہر قسم کی گفتگوئین شروع ہوئین، اور اسی سلسلے مین ایک تقریب سے صوبجات کے ایک دیوانی کے عہدہ دار کا ذکر آیا کہ وہ کاروبار اور تمام معاملات مین نہایت سخت گیری سے کام لیتا ہے، اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ کارگذاری کا یہ مناسب طریقہ نہین، کیونکہ کام مین سخت گیری اور اس کے دائرے مین تنگی کرنے کا انجام یہ ہوگا کہ کامون کے کرنے مین سستی اور کاہلی ظاہر

ہو گی اور ملک مین فتنہ و فساد پھیل جائے گا، جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت مین ہوا، کہ وہ اگرچہ خلیفۂ برحق اور امام مطلق تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے قول کے موافق حق و صداقت کے ساتھ کام کرتے تھے، تاہم کوئی کام ان کی مرضی کے مطابق نہین ہوا، کیونکہ وہ دین اور دنیا کے کسی کام مین سہل انگاری اور رو و رعایت سے کام نہین لیتے تھے، اس لیے دنیا کے لوگ جو دین و آخرت کے بالکل مخالف بلکہ سراپا باطل ہین، اٹھ کھڑے ہوئے، اور فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کیا (عمل صالح جلد دوم ص۲۴۲)،

اسی اثنا مین سید جلال بخاری نے شاہجہان کے ایک ارشاد عالی کا حوالہ دیا کہ دنیا دو پاؤن پر قائم ہے، ایک حق دوسرا باطل لیکن سید جلال بخاری نے کہا کہ مین چاہتا ہون کہ حق پر قائم ہو، شاہجہان نے کہا کہ حق و باطل ہر زمانہ مین رہا، اور اس سلسلہ مین یہ تقریر کی :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین تمام کامون کی بنیاد حق پر تھی، اور تمام ترقیان اس لیے ہوتی تھین کہ آپ کے وجود کی برکت سے اس زمانہ کے لوگ حق و صداقت پر تھے، اور سب کے دل فطری پاکیزگی اور صفائی کے علاوہ آپ کے مواعظ و نصائح سے پاک و صاف ہو گئے تھے، اس لیے حق و صداقت کے سوا کسی چیز کا نقش ان پر قائم نہین ہو سکتا تھا، اور باطل کے لیے ان مین کوئی جگہ نہ تھی، اس لیے تمام امور واقعہ کے مطابق حق و صداقت کے ساتھ انجام پاتے تھے، یہی حال خلفاے راشدین کے زمانے کا تھا، کہ جس طرح سورج کے ڈوبنے کے بعد بھی کچھ دیر تک روشنی قائم رہتی ہے، اسی طرح آفتاب نبوت کے ڈوبنے کے بعد بھی خلفاے راشدین کے زمانے کے لوگون کے دلون پر بھی غفلت کا زنگ لگنے نہ پایا، لیکن جب رفتہ رفتہ لوگون کے حالات بدل گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بالکل بعد ہو گیا اور لوگون کے دل زنگ خوردہ ہو گئے، نوبت یہان تک

پہونچی کر سیہ کار ظالمون نے حضرت عثمانؓ ذی النورین کی شمع زندگی کو بجھا دیا، اور اس حالت مین دنیا حق و صداقت پر قائم نہ رہ سکی، اسی بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اقامت حق مین جو ان کا مقصود تھا کامیابی نہ ہو سکی،" (عمل صالح جلد دوم صفحہ ۲۳)

شاہجہان شاعر تو نہ تھا، مگر شعر و شاعری سے اس کو غیر معمولی مناسبت تھی، جیسا کہ آیندہ صفحات سے اندازہ ہوگا، جب ہم شعرا کے ساتھ اس کی قدردانی کی تفصیل بیان کرین گے، مگر ایک بار اس نے شہزادہ اورنگ زیب کو ایک رباعی لکھکر اپنی پدرانہ محبت کا جو ثبوت دیا تھا، اس کا یہان پر ذکر کرنا شاید بے جا نہ ہوگا، اورنگ زیب کی شادی کی تقریب انجام پانے والی تھی، اورنگ زیب دولت آباد سے چل کر دہلی آیا تو نور منزل مین مقیم ہوا، شاہجہان اس مسرت و انبساط کے جشن کے موقع پر غایت اشتیاق مین بیٹے سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا، اس لیے کلیم کی یہ رباعی اپنے ہاتھ سے لکھ بھیجی:

با مژدہ اگر زود درآئی چہ شود	با تاختہ پیش از خبر آئی چہ شود
زود آمدنت نظر بشوقم دیر است	از زود اگر زود تر آئی چہ شود [1]

شاہجہان اپنے گوناگون مشاغل کے باوجود روزانہ کتابون کا مطالعہ جاری رکھتا تھا، جب تمام کامون سے فارغ ہو کر رات کو سونے جاتا، تو اس کے مقربان خاص پردہ کے پیچھے سے کتابین پڑھتے تھے، جو زیادہ تر انبیاء، اولیاء، و سلاطین کی سوانحعمریان اور تاریخین ہوتین، وہ ظفرنامہ اور واقعات بابری کو بہت پسند کرتا تھا، [2]

اس کا گھر خود علم و ادب کا گہوارہ تھا، [3] اس کے دربار مین علمی شان و شوکت، دیرینہ روایات کے ساتھ قائم رہی، وہ اہل علم و فضل کو کن نظرون سے دیکھا کرتا تھا، یہ ذیل کے پند و نصائح

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۳۴۴ [2] بادشاہ نامہ اول ص ۱۵۰، [3] شاہجہان کی اولاد کی علم نوازی کا حال ہم تیموری شہزادون اور شہزادیون کے علمی ذوق کے سلسلے مین لکھین گے،

سے معلوم ہوگا، جو اس نے اپنی بیاض خاص مین لکھ رکھی تھین،

رونداون بمردم بد، نہ رنجیدن بعدم حصول مقصد، نہ رنجانیدن مردم خوب مزاج، نہ خواستن بکمال احتیاج، صحبت داشتن باہل معاد، جستجو کردن قابلان باستعداد، باز نداون پیش خود بمردم جہان، دادن بارباب استحقاق بقدر توفیق پیش از سوال، بکرم داشتن اہل فضل معروف نمودن مزاج بعدل، میل نکردن باقوال غیر عقائد، بے خبر نبودن از احوال متوکلان بے مکائد، غنیمت داشتن وجود یگانگان کہ بیگانہ از خلق باشند، پیش داشتن ہمیشہ مصالح امور دنیا وعقبیٰ بودند"

یہ نکات علمی اور عملی حیثیت سے کس قدر سبق آموز ہین، عالمگیر نے ان کو شاہجہان کی بیاض سے نقل کرکے اپنے فرزند عالیجاہ شاہزادہ معظم کو بطور نصیحت لکھ بھیجا تھا،[1]

شعراء | اکبر اور جہانگیر نے شعراء کی سرپرستی مین جو شاہانہ فیاضیان کین، ان کے غلغلہ سے ہندوستان اور ایران گونج رہا تھا، ایران سے شعراء ہندوستان امڈے چلے آرہے تھے، اور بقول مولانا شبلی ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے، چنانچہ شاہجہان کے دربار مین بھی شعراء کی تعداد بکثرت رہی، بلکہ وہ اپنی فیاضی و قدردانی مین اکبر اور جہانگیر دونون سے بازی لے گیا، اس نے شعراء و فضلاء کے ساتھ جود و دہش اور انعام و اکرام کا ثبوت دیا ہے اس کی نظیر مثال شاید ہی کسی حکمران خاندان مین پائی جائے گی،

لطف اللہ مہندس[2] نے جو دارا شکوہ کے مقربان خاص مین تھا، شاہجہانی شعراء کے نام مندرجہ ذیل اشعار مین نظم کئے ہین:-

---

[1] وقائع عالمگیری مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی۔ [2] لطف اللہ مہندس کے حالات کے لیے دیکھو مضمون تاج محل اور لال قلعہ کے معمار، از علامہ سید سلیمان صاحب ندوی، معارف فروری و مارچ، اپریل ۱۹۳۶ء

وحید دہر امانی ین تہابت خان — ولے نجان زمان است شہرۂ دوران

دگر یگانہ ظفر خان تخلص احسن — ربودہ گوے سخن از سخنوران دفن

دگر وحید زمن آشنا عنایت خان — بود بحر سخن آشنا عنایت خان

دگر وحید زمن شادمانِ غم پرور — بیان شادی و غم در کلام او مضمر

دگر سخنور کشمیر محسن فانی است — بقائے نام وے از دولت سخندانی است

مہ سپہر سیادت یگانہ میر عماد — کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد

لبیب عصر محمد حسین آشوب است — سخنورے کہ سخنہاش جملہ مرغوب است

دگر وحید زمان مست طالبائے کلیم — کہ شعر او ید بیضا است نزد طبع سلیم

دگر فرید جہان قدسی محمد خان — بعہد شاہجہان گو ربودہ از اقران

الٰہی ہمدانی است در سخن استاد — سخنورے است کہ داد سخنوری می داد

لبیب از منہ امی نخواند ہیچ کتاب — ز فیض حق شدہ مفتوح بر رخش صد باب

دگر وحید زمن باقیا ترانہ او — خوش است ہمچو غزلہائے عاشقانہ او

فصیح از منہ فتحا کہ چو غزل می گفت — چو عندلیب غزلخوان در و گہر می گفت[1]

اس چمنستان شعراء کا گل سرسبد حاجی محمد جان قدسی تھا، جس کو تمام انواع سخن پر قدرت حاصل تھی، مشہد کا رہنے والا تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں تعلیم پاکر ہندوستان آیا، خواجہ عبداللہ خان زخمی کی مدح میں، جو ہفت ہزاری منصب کا شاہجہانی امیر تھا، ایک قصیدہ کہا، عبداللہ سفر میں تھا، قدسی نے قصیدہ پڑھا۔ تو عبداللہ خان اس قدر متاثر اور محظوظ ہوا کہ اپنی مسند سے اٹھ گیا، اور قدسی کو اپنی جگہ پر بٹھایا، پھر باہر نکل کر اپنا خیمہ اور اس کے تمام متعلقات اور لشکر کی تمام چیزیں

[1] دیکھو مضمون ہذا و فہرست کتب خانہ شاہ اودھ از ڈاکٹر اسپرنگر ص ۱۱۶

قدسی کو انعام میں دیدیں،[1] ۱۰۴۲ھ میں قدسی شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ایک قصیدہ کہا جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

اے قلم برخود ببال از شادی وبکشا زبان — در ثنای قبلۂ اقبال خاقان زمان

جوہر اول شہاب الدین محمد کز ازل — از برای خدمتش زد چرخ دامن برمیان

اختر برج کرامت مظہر لطف ازل — جوہر تیغ شجاعت مصدر امن وامان

آنکہ از آغاز فطرت بستہ شہباز ظفر — چو عقاب تیر بر شاخ کمانش آشیان

گر مخالف ور موافق از ولایش دم زنند — با بد و نیک است چون خورشید گرم مہربان

سرمۂ چشم غزالان سازد از داغ پلنگ — سازگاریہای عدلش چو نہد پا درمیان

شہرت آثار عدلش زود برخواہد گرفت — تہمت زنجیر عدل از گردن نوشیروان

خوش نشست از نقش پایش نقش بعث اہل علم — ربع مسکون گو دگر بنشین بعیش جاودان

آفتابی اینچنین طالع نہ شد در ہیچ قرن — از زمان حضرت صاحبقران تا این زمان

حبذا دولت کہ بیند باتو خود را در رکاب — مرحبا نصرت کہ باشد باتو دایم ہمعنان[2]

مرآۃ الخیال کے مؤلف کی روایت ہے کہ اس قصیدہ کے صلہ میں شاہجہان نے قدسی کے منہ کو سات دفعہ جواہرات سے بھرا، اصل عبارت کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

"چند روز کے بعد (یعنی عبداللہ خان سے انعام پانے کے چند دن کے بعد) محمد جان نے صاحبقران ثانی کی مدح میں اور بھی زیادہ رنگین قصیدہ کہکر سنایا، بادشاہ عبداللہ خان کی بخشش کا حال سن چکا تھا، اس نے کہا کہ حاجی! عبداللہ خان نے تم کو جو انعام دیا ہے وہ کوئی اور نہیں دے سکتا ہے، لیکن اس نے جواہرات کی مختلف قسمیں طلب کیں،

[1] مرآۃ الخیال ص ۱۲۰، [2] عمل صالح ج ۱ ص ۹ - ۳۰۸،

اور حکم دیا کہ اس کا (یعنی قدسی کا) منہ سات باران موتیون سے پر کیا جائے، سامنے سونے کا طشت رکھا ہوا تھا، قدسی کا منہ بھر جاتا تو اس طشت میں موتیوں کو گرا دیتا تھا (ص ۱۴۴)

اس قصیدہ کے بعد شاہجہان نے قدسی کو اپنے دربار سے منسلک کر لیا، جہان سے اس کو روزانہ وظیفہ ملتا تھا، اور جب اس نے دربار مین اپنی شاعری و نکتہ سنجی کا سکہ بٹھا دیا، تو ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، ۱۰۴۵ھ مین اس نے جشن نوروز کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا جس کو شاہجہان نے بہت پسند کیا، انعام مین اس کو روپے مین تلوا دیا، جو وزن مین پانچ ہزار پانچ سو تھے[1]۔ ۱۰۴۹ھ مین قدسی کو کچھ اشعار کے صلہ میں سو اشرفیان مرحمت ہوئین، جہان آرا بیگم کی صحت یابی کے موقع پر قدسی نے ایک قصیدہ کہا تو شاہجہان نے دو ہزار روپے عطا کئے[2]۔ جہان آرا بیگم کے جلنے کے موقع پر قدسی نے ایک رباعی کہکر گذرانی، اس کی آخری بیت یہ ہے (کلمات الشعرا)

ناسر زدہ از شمع چنین بے ادبی   پروانہ ز عشق شمع وا سوختہ است

قدسی کا انتقال ۱۰۵۶ھ میں ہوا ابو طالب کلیم نے ایک مرثیہ لکھا جس کے ایک ترکیب بند سے تاریخ نکلتی ہے، ع دو را زان بلبل قدسی جمینم زندان شد،

قدسی نے ایک مثنوی "تعریف کشمیر و صعوبت راہ" بھی لکھی، (کلمات الشعرا، قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی)

قدسی کا مد مقابل ابو طالب کلیم تھا، کلیم کاشان کا رہنے والا تھا، جہانگیر کے عہد حکومت مین ہندوستان آیا، لیکن ۱۰۲۸ھ مین وطن واپس چلا گیا، پھر ہندوستان آیا، جہانگیر

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۱۴۲ [2] عمل صالح حصہ دوم ص ۱۸۰، سرو آزاد (ص ۶۲) مین ہے کہ قدسی بادشاہ نامۂ صاحبقرانی بہ نظم آوردہ۔" تذکرۂ سرخوش مین ہے کہ "ظفر نامہ شاہجہان باحسن وجوہ و طرز دلخواہ بہ فصاحت و بلاغت تمام ادا کردہ"

کے دربار مین ملک الشعراء طالب آملی کے مقابلہ مین اگرچہ اسکو فروغ حاصل نہ ہوسکا ، لیکن شاہجہان کے عہد مین کلیم کا کلام شعلۂ طور بن کر چمکا، اس کے اشعار کے حسن تعلیل، خیال بندی، ترکیبون کے سلجھاؤ، روزمرہ کی صفائی، محاورات کی برجستگی، شستگی اور روانی سے اس عہد کی شاعری جگمگا اٹھی، اسی لیے شاہجہان کے دربار سے اس کو ملک الشعراء کا خطاب ملا، ۱۰۴۴ھ مین جب شاہجہان نے ایک کرور روپیہ کی لاگت سے تخت طاؤس تیار کرایا، اور آگرہ مین جشن نوروز کے موقع پر اسپر جلوس کی رسم ادا کی تو دربار کے شعراء نے اس تقریب میں قصائد کہہ کر اپنی لیاقت و ذہانت کا ثبوت دیا، کلیم نے بھی ایک قصیدہ کہا جس کے جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہون،

خجستہ مقدمہ نوروز و غرہ شوال	فشاندہ اند گل عیش بر سر مہ و سال
بچشم مردم دارالخلافہ عید نویست	غبار موکب شاہجہان جہان جلال
شرف پذیرد نوروز چنین عیدی	کہ بادشاہ نشیند بہ تخت استقلال
بوصف تخت مرصع گہرفشان گشتم	خدا نصیب کند عمر خضر و طول مقال
ہزار سیلان یاقوت صد بدخشان لعل	برونمائی گرفت است تا نمود جمال
توان ز آتش یاقوت آن چراغ افروخت	کہ نے ز باد رسد آفتش نہ ز آب زلال
فتادہ پرتو یاقوت و لعل بر الماس	چنانچہ عکس چراغان فتد در آب زلال
زمرد گلش تازہ تر ز سبزۂ نو	کہ اجتماع نقیضین را شمردہ محال
طلائے تخت شدی آب آتش یاقوت	اگر نہ قطرہ فشانی می شدی زلال لال
بماند ازو دو دیگر ہر انچہ خواہی ہست	ز شان و شوکت و فر و شکوہ و حسن و جمال

شاہجہان کو یہ قصیدہ اس قدر پسند آیا کہ کلیم کو اس کے صلہ میں روپے کے برابر تلوایا جو ۵۵۰۰ وزن مین آئے، اور اس کو عطا کئے ۱۰۵۰ھ مین جشن اوزن شمسی کے موقع پر شاہی خزانہ سے کلیم کو کچھ

ا بادشاہ نامہ
عمل صالح

(بسو ریہ)
۲ ...
۴۸

اشعار کے صلہ مین ایک ہزار روپے ملے، سنہ ۱۰۴۹ھ مین کلیم شاہجہان کے ساتھ کشمیر گیا، اس جگہ کی دلآویزیون اور رنگینیون کو دیکھ کر فریفتہ ہو گیا، بادشاہ سے وہان قیام کی اجازت چاہی، جو منظور ہوئی، یہین بیٹھکر شاہی فتوحات منظوم کرتا تھا، جس کے لیے کلیم کو سالانہ وظیفہ ملتا تھا، سنہ ۱۰۵۵ھ مین شاہجہان پھر کشمیر گیا، تو کلیم نے تہنیت کا قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس کے انعام مین خلعت اور دوسو اشرفیان پائین، شاہجہان جب واپس ہونے لگا، تو کلیم نے پھر ایک قصیدہ کہا، اور دوسو اشرفیان پھر انعام مین ملین[1]، کلمات الشعراء، مؤلفہ سرخوش مین ہے کہ قیصر روم نے شاہجہان کو خط لکھ کر یہ اعتراض کیا کہ صرف ہندوستان کا بادشاہ ہو کر شاہجہان کا لقب اختیار کرنا صحیح نہیں، اس اعتراض پر شاہجہان بھی کچھ پریشان ہوا، اور یمین الدولہ سے اپنے لقب کو بدلنے کے لیے مشورہ کرنے والا تھا، کہ کلیم نے ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس مین لقب کی یہ توجیہ کی،

ہند و جہان زروی عدد ہر دو چون یکیست
شہ را خطاب شاہ جہانی مبرہن است[2]

شاہجہان نے خوش ہو کر روپے مین اس کو تلوا دیا،

کلیم نے بہت سے قصائد کہے[3]، ان قصائد مین طبیعت کا اصلی زور تشبیب خصوصاً بہاریہ تمہید

---

[1] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۴۶۸، نیز شعر العجم حصہ سوم نماثر الکرام دفتر ثانی ص ۵۸ [2] یہ شعر اس طرح بھی نقل کیا گیا ہے

ہند و جہان ز روے عدد چون برابر است
بر شہ خطاب شاہجہان زان مقرر است

[3] مولانا شبلی شعر العجم حصہ سوم (ص ۲۱۷) مین اس کے ایک قصیدہ کا کچھ حصہ نقل کرتے ہین، جو شاید شاہجہان ہی کی شان مین کہا گیا تھا، اس کی جدت آفرینیان ملاحظہ ہون

بعہدش آنچنان در خواب امن است
کہ باید پا سبانے پاسبان را

بملکش راہ زن مانند بادہ
بمنزل میرساند کاروانرا

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۸۳)

مین صرف کرتا تھا، مگر بقول مولانا شبلی کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے [۵] اس کا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے، اس کا ہر شعر قوت تخیل کا ایک منظر ہے، جب اس کا انتقال ہوا تو غنی کشمیری نے تاریخ وفات یہ کہی

گفت تاریخ وفات او غنی   طور معنی بود روشن از کلیم
۱۰۶۱ھ

کلیم نے بہت سی مثنویاں بھی لکھین، تعریف اکبرآباد، قحط دکن، صعوبت دکن کے علاوہ ایک مثنوی بادشاہ نامہ بھی قلمبند کی، جس مین عہد شاہجہانی کے ۱۰۴۶ھ تک کے حالات ہین، یہ شاید قدسی کی مثنوی ظفرنامہ شاہجہانی کے تتبع مین لکھی گئی جس مین ۱۰۴۱ھ تک کے واقعات ہین،

(بقیہ حاشیہ ص) بعہد عدل او واپس ستاند   چمن از خاک زرہاے خزان را

کفش برداخت کان گوہر و زر   فلک برچید آخر این دکان را

درون شیشۂ افلاک بیند   لبان ... فضاے آسمان را

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] مراۃ الخیال ص ۱۴۶-۱۴۵) میں کلیم کی کچھ منتخب غزلین منقول ہین، ان مین سے ایک ہم بھی ناظرین کی ضیافت کے لیے پیش کرتے ہیں،

پیری رسید و مستی طبع جوان گذشت   ضعف تن از تحمل رطل گران گذشت

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست   رو پس نکرد ہر کہ ازین خاکدان گذشت

در راہ عشق گریہ متاع اثر نداشت   صد بار از کنار من این کاروان گذشت

طبعے بہم رسان کہ بسازی بعالمی   یا ہمتی کہ از سر عالم توان گذشت

در کیش ما تجرد عنقا تمام نیست   در قید نام ماند اگر از نشان گذشت

بدنامی حیات دو روزی نبود بیش   ہم گویم کلیم با تو کہ آنہم چسان گذشت

یک روز صرف بستن دل شد باین و آن   روز دگر بکندن دل زین و آن گذشت

کلیم کو شاہ جہان کی فرمایش پر شعر کہنے کی قدرت اتنی حاصل تھی کہ اس نے شاہی تخت مرصع، شاہی سپر، شاہی شمشیر اور شاہی قلمدان پر اشعار کہے، شاہ جہان نے اپنی ہر چیز پر اس کے اشعار کندہ کرا دیے تھے، (کلمات الشعرا قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی)

ظفر خان احسن کو شاہ جہانی عہد کا عبد الرحیم خانخانان سمجھنا چاہئے، مجمع النفائس مین ہے[۱]

"بعد از عبد الرحیم خانخانان مثل او از امرائے ہند یہ نشان ندارد"

نام اصلی احسن اللہ، تخلص احسن اور ظفر خان خطاب تھا، اس کا باپ خواجہ ابو الحسن تربتی خراسان سے اکبر کے زمانہ مین ہندوستان آیا، شہزادہ دانیال کا وزیر اور دکن کا دیوان مقرر ہوا، جہانگیر کے زمانہ مین پہلے میر بخشی پھر دیوان کل کے عہدہ پر مامور ہوا، اور پنج ہزاری منصب سے سرفراز کیا گیا، کابل کا حاکم بھی مقرر ہوا، شاہجہان کے زمانہ مین شش ہزاری و شش ہزار سوار کا منصب اور کشمیر کا علاقہ عطا ہوا، اس کے مرنے کے بعد احسن اللہ شاہانہ عنایت سے مستفیض ہوا، جہانگیر کے زمانہ ہی مین وہ باپ کی جگہ کابل کا حاکم، اور ظفر خان کے خطاب سے سرفراز کیا جا چکا تھا، شاہجہان نے خواجہ ابو الحسن کی زندگی ہی مین ظفر خان کو کشمیر کی حکومت تفویض کی، جہان سے اس نے تبت پر فوج کشی کی، کچھ دنون ٹھٹھ کا بھی حاکم رہا، وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، مرزا صائب سے مشق سخن کرتا، .... رفتہ رفتہ اس کا ذوق اتنا بڑھا کہ خود مرزا صائب اس کی سخندانی کا مداح ہو گیا، جب صائب کے کلام پر نکتہ چینی کرتا تو خود صائب اس کی داد دیتا، چنانچہ صائب ظفر خان کو مخاطب کرکے ایک قصیدہ مین کہتا ہے:

تو جان زدخلِ بجا مصرع مرا دادی   تو از فصاحت دادی خطاب سحبانم

صائب کو ظفر خان کی مداحی پر فخر تھا، اس کی شان مین بہت سے قصائد کہے، ظفر خان

---

[۱] مجمع النفائس قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

بھی اس کا بڑا قدر دان تھا، ارباب علم کے ساتھ اس کی فیاضی مشہور تھی، مآثر الامراء جلد ۲ (ص ۷۶۱) میں ہے،

"ظفر خان ایرانیوں کو بکثرت روپے دیتا تھا خصوصاً شعراء کے ساتھ خوب بذل و کرم کرتا، صاحب استعداد شعراء اپنے وطن سے دل برداشتہ اس کی بارگاہ میں پہنچتے، اور جن احسانات کی توقعات کے ساتھ آتے، وہ پوری ہوتیں، افصح المتاخرین مرزا صائب تبریزی ایران سے کابل آیا تو اس کی (یعنی ظفر خان کی) گرم جوشی اور فیاضی سے اس کی صحبت میں اس کی دلبستگی ایسی ہوئی کہ مدتوں ظفر خان کے ساتھ ہندوستان میں رہا، چنانچہ کہتا ہے،

خانِ خانان را بہ بزم و رزم صائب دیدہ ام
در سخا و در شجاعت چون ظفر خان تو نیست

ظفر خان کے ذوق شاعری کا اندازہ اس سے بھی ہوگا کہ وہ اپنے عہد کے تمام شعراء مثلاً صائب، کلیم، قدسی، سعیدای زرگری، سالک یزدی، سالک قزوینی، دانش اور میر صیدی وغیرہ کے کلام کو ایک بیاض میں ہر ایک کے دست خاص سے لکھوایا تھا، اور ہر ایک کی تصویر اس کے ساتھ منسلک کرائی تھی[۱]، وہ خود بھی صاحب دیوان تھا، میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اس کے دیوان سے مآثر الکرام جلد دوم (ص ۹۶) میں حسب ذیل اشعار منتخب کئے ہیں:

دلم بکوے تو امید وار می آید | نگاہ دار کہ روزے بکار می آید
درگوشۂ میخانہ ہمین گفت و شنید است | یاران برسانید دماغے شب عید است
دربستان ہند چون او دلبر خود کام نیست | رام رامم گرچہ می گوید ولیکن رام نیست

---

[۱] مآثر الامراء جلد دوم ص ۷۶۱ و مجمع النفایس

شادم بدل شکستگی خود کہ پیش من | قدر دل شکستہ چو زلف شکستہ است
گوشہ چشمی اگر ساقی بما دارد بجاست | عمرہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ام

ظفرخان نے دو مثنویاں بھی لکھیں، ایک لاہور، پنجاب، کشمیر اور آگرہ وغیرہ کی تعریف میں تھی، دوسری مثنوی کا نام میخانہ زار تھا،[۱]

مرزا محمد طاہر آشنا۔ ظفرخان کا لڑکا تھا، اس کی ماں بزرگ خانم ممتاز محل کی بڑی بہن ملکہ بانو کی لڑکی تھی، شاہجہان نے اس کو بہت ہی کم عمری میں یعنی جب وہ صرف سات سال کا تھا منصب عطا کیا، اور جب سن شعور کو پہنچا تو ہزار و پانصدی کے منصب پر مامور ہوا، اور اسی کے ساتھ "داروغہ حضور" بنایا گیا، یہ عہدہ صرف خاندان کے معتبر اراکین کیلئے مخصوص ہوتا تھا، شاہجہانی عہد کے آخر میں وہ شاہی کتب خانہ کا داروغہ مقرر ہوا، شاہجہان نے اس کو ہمیشہ اپنا ندیم خاص بنا کر رکھا، آشنا نے اپنی عمر کا آخری حصہ کشمیر میں گذارا، عالمگیر کے زمانہ میں اس کو چوبیس ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ ملتا تھا، باپ سے شعر و شاعری کا ذوق وراثت میں پایا تھا،

مآثر الامراء میں ہے:

"در معنی بندی و سخن سنجی استاد است، صاحب مثنوی و دیوان"[۲]

تذکرہ نصر آبادی کا مولف رقمطراز ہے:

"بڑا سمجھدار جوان تھا، لیکن طبیعت میں شوخی تھی، اپنے دوستوں مثلاً ابوطالب کلیم اور دوسرے شعراء کو اپنے گھر میں بلاتا، اور کھانے کی چیزوں میں نشہ آور چیزیں ملا دیتا، ...... مجھ پر بھی وہ مہربان تھا، اور اس سے غائبانہ ملاقات تھی، کئی بار خط بھی لکھا، اپنا دیوان، خسرو کی غزلیات اور دوسری کتابیں بھی میرے پاس بھیجیں، شاعری میں اس کو

[۱] فہرست کتب خانہ شاہ اودھ ص ۲۲۶۔ [۲] مآثر الامراء جلد دوم ص ۷۶۲،

بڑی قدرت تھی، آشنا تخلص کرتا تھا، سنا ہے کہ دو سال ہوئے اسکا انتقال ہوگیا ہے"
یہ لکھکر آشنا کی رباعیان اور اشعار بھی نقل کیے ہین، مثلاً شاہی آئینہ خانہ کی تعریف
مین وہ کہتا ہے:

حبذا این نشیمن والا — کہ بود رشک عالم بالا
دل زکف بردہ حسن دلجویش — طاق آئینہ چشم و ابرویش
کردہ بناے این نکو منزل — از یک آئینہ اش تمام چو دل

ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہون:

چشم آن لحظہ کہ در ہجر تو بیمار شود — خارپشت مژدہ ام غیرت گلزار شود
عقل ناچار کشد زحمت آلایش نفس — دایہ پرہیز کند طفل چو بیمار شود

ایک رباعی بھی سننے کے قابل ہے:

کم ظرف زعشق خرمن ہستی سوخت — پر حوصلہ نور زندگانی افروخت
کاہید خرد زعشق و افزود جنون — از باد چراغ مرد و آتش افروخت[1]

کشمیر پر ایک مثنوی بھی لکھی[2]، ایک ساقی نامہ بھی اس کی طرف منسوب ہے، وہ جب شاہی کتب خانہ کا نگران تھا، تو عبدالحمید لاہوری اور محمد امین قزوینی کی تاریخون کا ایک ملخص تیار کیا، جس مین شاہجہانی عہد کے پہلے تیس سال کے حالات تھے،[3] الیٹ نے شاہجہان نامہ کے نام سے اس کے اقتباسات جلد ہفتم مین دیے ہین،

جہانگیری عہد کے جلیل القدر امیر اور شاہجہان کے مربی مہابت خان سپہ سالار کا لڑکا

---

[1] تذکرہ نصرآبادی ص ۵۹-۵۸ [2] فہرست کتبخانہ شاہ اودھ ص ۳۲۹ [3] برٹش میوزیم کیٹلاک، فارسی مخطوطات جلد اول ص ۲۶۱

مرزا امان اللہ بھی صاحب علم اور صاحب سخن تھا۔ امانی تخلص کرتا تھا، جہانگیر کے زمانہ میں اس کو سہ ہزاری منصب اور خانہ زاد خان کا خطاب ملا، شاہجہان نے اس کو پنجہزار سوار کا منصب اور خان زمان کا خطاب عنایت کیا، مختلف اوقات میں وہ کابل، بنگالہ، مالوہ اور دکن کا صوبیدار رہا، شجاعت وسپہگری کے علاوہ علوم وفنون کی سرپرستی کے لیے بھی مشہور تھا، اس کی کئی تصانیف تھیں، تاریخ سلاطین عالم، مجموعۂ گنج بادآورد، اور ایک دیوان تھا[۱]، اس کی سخن سنجی کی داد تذکرہ نگاروں نے دی ہے، تذکرہ نصرآبادی میں ہے (ص ۵۹)

"شعرش خالی از لطفی نیست"

آزاد بلگرامی ید بیضا میں لکھتے ہیں:

"در وادی شعر بغایت خوش سلیقہ است"

مرزا محمد طاہر نصرآبادی نے اس کے جو اشعار پسند کیے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

بہ دور جام ما بنویسید نام او | تا نام ما بدور بماند ز جام ما
دوران اگر بکام نگرد دید گو نگرد | این بس کہ دور جام نگردد بکام ما

ہر نفس از گریہ می شویم دل افسردہ را | شست شو از آب حیوان می دہم این مردہ را

(رباعی)

بیگانہ خویشم آشنا می خواہم | در پہلوی عندلیب جا می خواہم
چون غنچہ حیای شگفتن شدہ ام | تحریک نسیمی از صبا می خواہم

سلطان شادمان۔ پنجاب اور حسن ابدال کے درمیان بسنے والی قوم گکھر کے حکمران خاندان کی نسل سے تھا، مرآۃ الخیال کا مصنف اس کو ایک "عالی فطرت" اور "نیکو بیان" شاعر کہتا ہے، اس کی زبان میں لکنت تھی، مگر شاہ جہان کو اس کا کلام بہت پسند تھا اسی وجہ سے اس کو انعام و اکرام

[۱] مآثر الامراء جلد اول ص ۷۰۴،

سے مالا مال کرتا رہتا تھا،[1] جب تخت طاؤس تیار ہوا تو قدسی، کلیم اور دوسرے درباری شعراء کے ساتھ شاداں نے بھی ایک قصیدہ کہا جو پسند کیا گیا، اور وہ یہ ہے:

صبحدم کز فیض گشتم ہمنشین آفتاب — نقش نام شاہ دیدم در نگین آفتاب
شاہ دین پرور شہاب الدین محمد بادشاہ — ثانی صاحب قران مد قرین آفتاب
تا قرین آفتابش گفتہ ام ہستم خجل — زانکہ باشد سایۂ حق برترین آفتاب
معجز وصف سریرش بین کہ میکارم بذوق — تخم گلہای مدیحش در زمین آفتاب
تخت شاہنشاہ ما ز آب گہر پیدا کند — موج دریای خجالت بر جبین آفتاب
صفحۂ اشعار من از وصف تخت بادشاہ — چون ید بیضا بود در آستین آفتاب
روی اورنگ شہنشہ ز آب و تاب لعل و دُر — خیرگی بخشد بچشم دوربین آفتاب
خوبی اعجاز مدح شاہ را نازم کہ ساخت — از بلندی معنی من دلنشین آفتاب
شاداں ظل شہنشہ بر جہان پایندہ باد — تا بود رخش فلک در زیر زین آفتاب[2]

شیخ محمد محسن فانی کشمیری ملا طاہر غنی کشمیری کے استاد تھے، جو ان کے علمی کمالات کی بہت بڑی دلیل ہے، مراۃ الخیال میں ہے

"سالک مسالک نکتہ دانی شیخ محسن فانی فاضل متبحر و صاحب جاہ و پاکیزہ روزگار و خوش گو و خوش صحبت بودہ" (ص ۲۵۴)۔

ید بیضا میں آزاد بلگرامی لکھتے ہیں

از اہالی کشمیر است، درویشی صوفی مشرف صاحب ذوق بودہ، غنی کشمیری بخدمت وی

---

[1] مراۃ الخیال ص۲۵ میں ہے "شاداں باوجود لکنت زبان طبعی بغایت چالاک داشت و صاحب قران ثانی با فکر ش ہموارہ سرخوش بودہ مورد انعامات فاخرہ میگر دانید" [2] ایضاً ص۲۵۱

کسب کمالات کردہ"

صبح گلشن (ص ۳۰۸) مین ہے:

"وی در اکثر علوم علم یکتائی می افراشت"

داراشکوہ کے بھی ندیم خاص رہے، اور اس کے یہان بڑی ثروت وعظمت حاصل کی، شاہ جہان نے الہ آباد کی صدارت تفویض کی، یہان حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس سرہٗ سے سلوک کی تعلیم پائی، اور تصفیۂ دل اور تزکیۂ باطن کی نعمت سے سرفراز ہوئے، مگر جب نذر محمد خان والی بلخ و بخارا کو شاہی فوجون سے شکست ہوئی تو اس کے مال واسباب مین شیخ فانی کا ایک دیوان بھی پایا گیا، جس مین اس کی شان مین ایک قصیدہ بھی تھا، شاہجہان کو یہ بات ناگوار ہوئی، اور شیخ فانی کو صدارت کے عہدہ سے معزول کر دیا، لیکن ان کے علم وفضل کی قدر کی، اور سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا، فانی نے بقیہ عمر کشمیر مین گزاری، ان سے فیضیاب ہونے کے لیے ان کے یہان امراء اور تلامذہ کا ہجوم رہتا تھا، ان کے کلام مین بڑی رنگینی، روانی اور لطافت ہوتی تھی، مثال کے طور پر ہم ایک قصیدہ پیش کرتے ہین، جو انھون نے شاہ جہان کی مدح مین کہا تھا، اس مین ہندی الفاظ اس طرح استعمال کیے گئے ہین کہ ان کی وجہ سے قصیدہ مین قبح کے بجائے حسن پیدا ہو گیا ہے، شاہ جہان کی فیاضی، کرم گستری اور زرپاشی کے ساتھ ہندوستان کی جو تعریف کی گئی ہے، وہ بھی لائق توجہ ہے،

نو بہار آمد بسیر گلشن ہندوستان	زیبد ار طوطی بجاے پر برآرد برگ پان
چشم مردم از سواد ہند روشن می شود	کو نیارد کس متاع سرمہ را از صفہان
در چمن ہر صبح مینا می کند راگ بسنت	نیست طوطی را بجز کلیان چو بلبل بر زبان
بسکہ دارد در چمن میل گرفتاری بسرو	زیبد ار قمری ز طوق خویش بندد آشیان

چانیہ می گیرد چو نرگس دست گلچین را بزر | لالہ می بندد حنا چون گل بپای باغبان

گل ز شبنم ہار چنبیلی بگردن افگند | تا تواند شد حریف شاہد ہندوستان

باغ و صحرا سبز شد از فیض ابر نو بہار | شد ہمہ صحنِ زمین ہمرنگِ بامِ آسمان

چشم نرگس از سواد ہند روشن می شود | در گلستان لالۂ از سرمہ پر شد سرمہ دان

گرچہ گلہا ہم غزلہا خواندہ در وصفِ بہار | لیک نبود در چمن چون سبزہ کس رطب اللسان

بسکہ سوسن می کند بادہ زبان وصف چمن | دور نبود گر ز حیرت غنچہ را وا شد دہان

تا لب جو سبز شد از فیض ابر نو بہار | جدول زنگار دارد صفحۂ آب روان

سیم و زر را وام می گیرد ز چنبیلی و سیل | نرگس از بہر نثار ثانی صاحبقران

بادشاہ قدر دان شاہجہان گر فیض او | گوشۂ باغ جہان شد رشک گلزار جنان

از ہوای گرم در ہندوستانش باک نیست | بر سرش سایۂ بال ہما شد سایہ بان

نیست تنہا باربردار وقار او زمین | بستہ گردون ہم کمر در خدمتش از کہکشان

جزیہ از کافر گرفتن پیش او چون قرض بود | ہمت از حاتم گرفت و عدل از نوشیروان

ہیچ کس از سفرۂ احسان او بے بہرہ نیست | شد ز دود مطبخش آباد چندین دودمان

در زمان دولتش نبود عدو ہم بے نصیب | می کشد در چشم دشمن سرمہ از میل سنان[1]

شیخ فانی نے ایک مثنوی مصدر الآثار بھی لکھی، اس کا آغاز اس شعر سے کیا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم | تازہ نہالے است ز باغ قدیم[2]

محمد حسین آشوب کے بارہ میں غلام علی آزاد بلگرامی صرف اتنا لکھتے ہیں کہ ماثر ندران سے آکر ظفر خان احسن کے دربار سے وابستہ ہوا، مگر لطف اللہ مہندس کی نظم سے پتہ چلتا ہے کہ

۱؎ مراۃ الخیال ص ۲۵۷ ۔ ۲؎ ید بیضا ص ۱۱۲ قلمی نسخہ دار المصنفین

وہ شاہجہانی دربار کے شعرا مین سے تھا، آزاد بلگرامی اس کے حسب ذیل دو شعر نقل کرتے ہین، مگر یہ بھی لکھتے ہین کہ یہ دونون شعر حسن بیگ رفیع کی طرف بھی منسوب ہین،

سبزہ از مژگان من نیز مشق شادابی گرفت ۔۔۔ نرگس از چشم ترم تعلیم بے خوابی گرفت

نقد اشکم را بزور از مردم چشمم ربود ۔۔۔ گرد او گردم کہ باج از مردم آبی گرفت [۱]

میر الہی ہمدانی۔ ہمدان کے علاقہ اسد آباد کے سادات مین سے تھا، اصفہان مین حکیم صفائی اور آقا رضی کی صحبت سے فیضیاب ہوکر ہندوستان آیا، اور شاہجہان کے دربار مین ملازم ہوا، آزاد بلگرامی اس کے کلام کے بہت مداح ہین، لکھتے ہین:

کلامش لطافتے و عذوبتے دارد، و مذاقہا را لذتے خاص می بخشد۔[۲]

غنی کشمیری بھی اس کے شاعرانہ کمال کا معترف تھا، چنانچہ الہی کی وفات پر یہ تاریخ کہی، ع

برد الہی ز جہان گوے سخن

کلام کا نمونہ یہ ہے:

زمانہ بسکہ مرا خاکسار مردم کرد ۔۔۔ ز آب دیدۂ من می توان تیمم کرد

رُباعی

از دوریت اے تازہ گل باغ مراد ۔۔۔ چون غنچہ چیدہ خندہ ام رفتہ زیاد

گریان چو پیالۂ پرم در کف مست ۔۔۔ نالان چو سبوی خالیم در رہ باد [۳]

امی شیرازی۔ نوشت و خواند سے بے بہرہ تھا، مگر شعر گوئی مین کافی شہرت حاصل کی، شاہجہان کے جود و سخا کی شہرت سنکر شیراز سے شاہجہان آباد آیا، اور شاہی دربار مین کئی قصائد پیش کئے، انعام و اکرام پاکر وطن لوٹ گیا،[۴] اس کا یہ شعر روز روشن مین منقول ہے:

---

۱ ید بیضا ص۱۷۱ ۲ مآثر الکرام جلد دوم ص۸۵ ۳ ایضاً، ۴ روز روشن مین ہے: امی شیرازی اگرچہ از نوشت و خواند

(باقی حاشیہ ص ۱۹۳ پر)

تا دلم در صفت حسن غزل خوان شدہ ست	وصف ابروئے تو سر مطلع دیوان شدہ ست

باقیا نائینی شاہجہانی دربار کا ایک مقبول شاعر تھا، نام باقی، اور وطن نائین تھا، عراق میں حکیم شفائی، اور خراسان میں مرزا فصیحی کی صحبت سے فیضیاب ہو کر ہندوستان آیا، طالب آملی کی وساطت سے مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ کے دربار میں پہنچا، اور ایک قصیدہ پیش کر کے تقرب حاصل کیا، پھر شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر ہوا،[1] اور جب شہزادہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس کو اپنی شاہانہ نوازش سے برابر سرفراز کرتا رہا، چنانچہ ۱۰۴۶ھ میں جشن نوروز کے موقع پر باقیا نے ایک قصیدہ کہا تو شاہجہان نے قدسی اور کلیم کی طرح اس کو بھی روپے سے تلوایا جو وزن میں پانچ ہزار ...... ہوئے،[2] شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بھی ماہر تھا، چنانچہ معاصر مورخین ان فنون لطیفہ میں اس کے کمال کے مداح اور معترف ہیں، عبد الحمید لاہوری کا بیان ہے:

باقیا نائینی را در شعر طبیعت روان و تصانیف فارسی او از آمیزش نغمات ہندوستانی تاثیر دارد"

عمل صالح (حصہ دوم ص ۲۳۰) میں ہے:

سخنورے طبع روان دارد، و در تصنیف و تالیف نغمات بروش موسیقائے یونان و فارس بے نہایت ماہر است و تصانیف خود را کہ بر وفق ریختہ طرز امیر خسرو و نغمہ ہائے رسائے ہند بر آمیختہ بہندام غریب و مطبوع مسامع و طبائع افتادہ"

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۲) بہ ہند است، لیکن کام فکر بر جادۂ خوشحالی می گذاشت، در عہد شاہجہان بادشاہ بشاہجہان آباد رسیدہ، قصائد فصیحہ بحضور شاہی گذرانید و بجائزۂ معتد بہ متمتع گشتہ بوطن خود باز گردید، (ص ۷۱)

(حواشی صفحہ ہذا): [1] میخانہ ص ۵۵۷، [2] آثر الکرام حصہ دوم ص ۱۰۰۔

میخانہ کا مؤلف رقم طراز ہے (ص ۵۶۰)

"رسالہ در علم موسیقی ترتیب دادہ کہ تا لغایہ کسے باین روش مرتب نساختہ

تذکرہ نصرآبادی کا مصنف بھی اس کی سخن سنجی کا معترف ہے، اور اس کے تین شعر اپنے تذکرہ میں نقل کئے ہیں (ص ۴۰۷)

زان زخم کوس توکل کاسمان از بہر من | می رساند روزی و چرخ دگر ہم می زند
ہمہ حاصل جہان را بہ نثار فقیر کن | بہ کافر و مسلمان بنشین و صلح کل کن
رفتہ بمنزل آنکہ مقصود عزیزان | باقیست کہ واماندہ درین مرحلہ تنہا

کچھ رندی و مستی کے اشعار بھی سنیئے:

توبہ کردیم کہ تا بادہ نباشد نخوریم | تا کہ ساقی پسر سادہ نباشد نخوریم
بادہ تا میکدہ معمور نباشد نکشیم | روزہ تا روزی آمادہ نباشد نخوریم[۱]

لطف اللہ کے گنائے ہوئے شعراء کے علاوہ بہت سے اور بھی ارباب سخن بارگاہ شاہجہانی سے منسلک تھے، ان میں سب سے پہلے مرزا صائب پر نظر پڑتی ہے، صائب کی ولادت تبریز میں ہوئی، لیکن تعلیم اصفہان میں پائی، شاعری میں حکیم رکنا مسیح کاشی اور حکیم شفائی کا شاگرد تھا، جہانگیر کے زمانہ میں تجارت کے سلسلہ سے ہندوستان آیا، جہانگیر کے دربار میں اس کی رسائی ہوئی، لیکن اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا جوہر شاہجہان کے زمانہ میں چمکا، شاہ جہان جب تخت پر بیٹھا تو اس نے ایک تاریخی قطعہ لکھا جس کے صلے میں شاہجہان نے اس کو بارہ ہزار روپے دیے، کچھ دنوں کے بعد منصب ہزاری اور مستعد خان کا خطاب بھی عطا کیا[۲]، ۱۰۳۹ھ میں شاہجہان نے دکن کا رخ کیا، تو مرزا صائب اس کے ہمرکاب تھا، شاہی دربار ہی میں ظفر خان احسن

---

۱ میخانہ ص ۵۶۰، ۲ مراۃ الخیال ص ۱۲۰

سے ملاقات ہوئی، پھر دونوں ایسے شیر وشکر ہوئے کہ اب بھی دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ ظفر خان کشمیر کا صوبہ دار مقرر ہوا تو مرزا صائب کو ساتھ لے گیا، ظفر خان کو مرزا صائب کی مداحی پر اور مرزا صائب کو ظفر خان کی شاگردی پر ناز تھا، سنہ ۱۰۴۱ھ میں صائب نے مشہد اقدس کی زیارت کو جانا چاہتا تھا تو شاہجہان نے زاد سفر کے لیے پانچہزار روپے عنایت کیے، صائب کے باپ کو اس سے ایسی محبت تھی کہ اس کی جدائی زیادہ دنوں تک گوارا نہ کی، اور خود ہندوستان آکر اس کو اپنے ساتھ وطن واپس لے گیا، ایران میں شاہ عباس ثانی نے اس کی بڑی قدر دانی کی، اور ملک الشعراء کا خطاب دیا، لیکن صائب کو ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہ کر یاد آتی تھیں۔

جب نواب جعفر خان عالمگیر کے عہد میں وزیر اعظم مقرر ہوا تو مرزا نے یہ شعر لکھ کر بھیجا،

دور دستان را باحسان یاد کردن ہمت است ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

جعفر خان نے پانچہزار روپے اور ایک دوسری روایت کے مطابق پانچہزار اشرفیاں بھیجیں، سنہ ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی، اس کے مزار پر اس کی ایک غزل کندہ ہے جسکا مطلع یہ ہے:

در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو عالم پر است از تو و خالیست جائے تو

ایک صاحب سخن نے اس کے مزار کو ایک پر فضا مقام پر دیکھکر یہ شعر بھی لکھ دیا ہے:

اے صبا آہستہ پا بر برگہائے غنچہ نہ پاسبانانند گلہا صائبا خوابیدہ است [1]

مولانا شبلی شعر العجم حصہ سوم (ص ۱۸۹) میں لکھتے ہیں کہ ایران میں شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور مرزا صائب پر ختم ہوگئی، اس وقیع رائے کے بعد کسی مزید تبصرہ کی گنجایش نہیں، مولانا شبلی کلمات الشعراء کے حوالہ سے یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا کی زندگی ہی میں اس کے کلام کو یہ حسن قبول حاصل ہو چکا تھا کہ سلاطین اور بادشاہ ایران سے اس کے کلام کی استدعا کرتے

---

[1] کلمات الشعراء ذکر مرزا صائب

کرتے تھے، اور تحفہ اور سوغات کی طرح اس کی غزلیں بھیجی جاتی تھیں[1]

ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ مرزا صائب نے شعر و شاعری میں حکیم رکنا مسیح کاشی سے تعلیم پائی، موخرالذکر کا پورا نام رکن الدین مسعود اور تخلص مسیح کبھی مسیحا اور کبھی مسیحی تھا، آبا و اجداد شیراز کے رہنے والے تھے لیکن کاشان میں توطن اختیار کر لیا تھا، طبابت خاندانی پیشہ تھا، اس لیے حکیم رکنا کاشی کے نام سے بھی شہرت پائی، ایران میں شاہ عباس صفوی کا ندیم خاص تھا، مگر کسی سبب سے مکدر خاطر ہو کر اس نے شاہ ایران کے دربار سے قطع تعلق کر لیا، اور یہ مطلع لکھا:

گر فلک یک صبحدم با من گران باشد سرش   شام بیرون می روم چون آفتاب از کشورش

اس کے بعد ہندوستان چلا آیا، اور اکبر و جہانگیر کے خوان کرم کی زلہ ربائی کی، کچھ دنوں مہابت خان اور اس کے لڑکے امان اللہ کی خدمت میں بھی رہا، شاہجہان جب تخت پر بیٹھا تو حسب ذیل قطعہ لکھ کر بارہ ہزار روپے انعام میں حاصل کیے،

بادشاہ زمانہ شاہ جہان   خرم و شاد و کامران باشد
بہر سال جلوس او گفتم   در جہان پادشاہ جہان باشد
۱۰۳۷ھ

سنہ ۱۰۴۱ھ میں مشہد اقدس کی زیارت کی اجازت شاہجہان سے لی تو خزانہ عامرہ سے زاد سفر کے لیے پانچ ہزار روپے عنایت کیے گئے، زیارت کے بعد وطن کی طرف مراجعت کی، اور وہیں سنہ ۱۰۶۶ھ وفات پائی، شاہجہان غائبانہ طور پر بھی اس کو یاد کیا کرتا تھا، اور وقتاً فوقتاً تحفے بھیجتا رہتا تھا[2]، ایک دیوان چھوڑا جس میں ایک لاکھ اشعار تھے، مرزا صائب نے اس کے دیوان کا انتخاب کر کے حق شاگردی ادا کیا، میخانہ کا مولف اس کے کمال شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

---

[1] شعر العجم حصہ سوم ص ۲۰۰
[2] [illegible] ۱۰۹–۸۹ ۲ج

اشعار دلپذیر بیش، بنایت رنگین و اغلاقات سخنانش بے نہایت متین است"۔ (ص۲۷۰)

غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی خزانۂ عامرہ میں اس کے اشعار کی فصاحت و بلاغت کی بڑی تعریف کی ہے،

سرخوش کلمات الشعراء میں رقمطراز ہے:

"در معنی یابی ید بیضا داشت، بسیار خوش فکر است"

یہ لکھ کر طرز کلام کا یہ نمونہ پیش کیا ہے:

در من آمیختہ ز تو اثر پیدا نیست — ہمہ شیر است درین کاسہ شکر پیدا نیست

آنچنان با تو یکی گشت وجودم اکنون — کہ ترا بے تو توان دیدن و بے من نتوان

تمام عمرم با شاہد و پیالہ گذشت — حباب وار مرا عمر در پیالہ گذشت

روز اول کاندرین ویرانہ بنہادم قدم — بازمی بایست گشتن دہر دیواری نداشت

ہمچو آن نگین کہ بہر نگین دان شدست خلق — او را خدا برای کنارہ آفریدہ است

میخانہ میں اس کا ایک ساقی نامہ اور دوسرے اشعار بھی درج ہیں، مخزن الغرائب میں بھی اس کے دیوان کے طویل انتخابات ہیں، موخرالذکر تذکرہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر کے زمانہ میں حکیم رکنا کاشی اس کی فیاضی کی بدولت ایک بڑی دولت حاصل کرکے وطن لوٹ گیا تھا، اور وہاں سے پھر آیا تو ایک سو پانچ سال کی عمر میں وطن واپس گیا، ...

رکنا کاشی کے دو بھائی حکیم قطبا اور حکیم نصیرا کا خاندان بھی شاہی عہدوں سے فیضیاب ہوتا رہا، حکیم قطبا کا لڑکا ضیاء الدین رحمت خان شاہجہان اور عالمگیر کے [illegible] امرا میں سے تھا، اور ابو طالب کلیم کی لڑکی اس کے حبالۂ عقد میں تھی، (دیکھو مآثر الامرا جلد ۲ صفحہ ۲۸۳)

حکیم رکنا کاشی نے شیدا کے ذوق سخن کی داد دی ہے،

مسیحا را بشیدا یان عالم الفتی باشد　　بجز شیدا نگوید شعر گو کس در زمین من

اور یہ دادو موجب تعجب ہے، کیونکہ تمام ایرانی شعرا شیدا سے نالان اور آزردہ خاطر ہے،
شیدا کو ایرانی شعرا کے احساس برتری سے چڑھ تھی، کشمیر پر اس نے نثر مین ایک کتاب لکھی ہے اس کے خاتمہ مین لکھتا ہے،

"اہل ایران ہندی نژاد ہونے کی وجہ سے میری کوئی حقیقت نہین سمجھتے ہین، وہ اسکو بھول گئے ہین، کہ جب حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے دنیا مین آئے تو سراندیپ کی زمین کو اپنی ذات سے مشرف فرمایا، اور اس پر تمام مورخین کا اتفاق ہے، اس لیے حضرت آدم علیہ السلام ہندی ہین، اور جن لوگون نے ہند مین نشوونما پائی ہے ان مین آدمیت زیادہ ہے، اصلی بات یہ ہے کہ ایرانی اور ہندی ہونا فخر کی سند نہیں ہے، آدمی کی عزت اس کی ذاتی عزت سے ہوتی ہے، اگر ایرانی طنز کرین گے کہ فارسی ہماری زبان ہے، تو اپنی زبان کو اپنے تالو مین نہ پائین گے، اور اگر زبان ان کے تالو مین ہو بھی تو مذاق شاعری سے آشنا نہ ہون گے، چونکہ شاعری کی مقدرت نہین رکھتے ہین، مجبوراً ہاتھ پاؤن مارتے ہین، ظاہر بین لوگ جو صورت کو دیکھ کر معانی کا پتہ نہین پا سکتے ہین، میری ظاہری حالت کو دیکھتے ہین، میرے رنگین معانی ان کے خلعت کی طرح خوبصورت ہین، اور ان کے اشعار میرے کپڑے کی طرح بدصورت، یہ میرے کپڑون پر نظر رکھتے ہین اور مین ان کے سامنے رنگین معانی پیش کرتا ہون، جو کچھ کہ بے تکلفی سے کہا گیا وہ سچ ہے، اور سچ سے رنجیدہ ہونا عقلمندون کا کام نہین، (مرآۃ الخیال ص ١٩٥)

ان ہی جذبات کی بنا پر اس نے ایرانی شعرا کی ہجو لکھی، طالب آملی کی مذمت کا ذکر پہلے آ چکا ہے، الٰہی ہمدانی پر ایک قطعہ لکھا،

اے نیر من کہ کردہ الٰہی تخلص　　از مرز لاہی از چہ الٰہی شدن خطا

زین رطب ویابسی کہ بود در کلام تو | گر منکر کلام الٰہی شوم رواست[1]

قدسی نے ایک قصیدہ کہا تھا، جس کا مطلع یہ ہے

عالم از نالۂ من بے تو چنان تنگ فضاست | کہ شنیدند از سر آتش نتواند برخاست

شیدا نے اس قصیدہ کے ہر شعر پر اعتراض کیا، اور ان اعتراضات کو منظوم کیا جن میں سے کچھ اشعار یہ ہیں:

اے سخن سنج ہنرمند باندیشہ بسنج | نقد ہر حرف بمیزان خرد بے کم و کاست
نالہ در سینہ ہوائیست کہ بے قصد رود | چونکہ از سینہ ہوا گیر شد از جنس ہواست
عالم از وی نشود تنگ ولیکن ز ملال | خلق عالم کز او تنگ نشیند رواست
خود گرفتم کہ جہان تنگ شد از نالۂ تو | کہ ز تنگی نظر از چشم نیارد برخاست
نیست ترتیب دو مصراع بہم ربط پذیر | کہ سیاق سخن از ہر دو باندیشہ جداست
تنگی عالم از نالہ بکیفیت اوست | کہ جہان تنگ ز اندوہ شدہ بر دلہاست
تنگی جا ز کجا تنگی اندوہ کجا | بیشتر از تن و جان تفرقہ ہم پیداست[2]

اسی طرح کی اور بھی ابیات ہیں، مراۃ الخیال کے مولف کا بیان ہے کہ شیدا کے یہ اعتراضات بہت مشہور ہوئے، مگر مرزا محمد طاہر نصرآبادی اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ شیدا نے اپنے اعتراضات میں ناانصافی سے کام لیا ہے، (ص ۴۴۴)

شاہجہان بھی شیدا کی گستاخی اور بے باکی سے کئی بار رنجیدہ ہوا، ایک بار شاہجہان نے اس سے پوچھا کہ "تم شعرا چھا کہتے ہو یا حکیم حاذق گیلانی"، شیدا نے بادشاہ کے اس سوال کو ناپسند کیا، کیونکہ وہ حکیم حاذق گیلانی کو اپنا مقابل نہیں سمجھتا تھا، اور اس کی ہجو کہہ چکا تھا،

---

[1] ید بیضا ص۶۲، [2] مراۃ الخیال ص ۱۴۶-۱۴۷

اس لیے جل کر بولا، ہم دونوں [illegible] اس شاہی دربار کا ادنی ملازم تھا، جو [illegible] کرتا تھا، شاہجہان اس جواب سے بہت کبیدہ خاطر ہوا، اور شیدا کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا، ایک [illegible] شیدا [illegible] شعر شاہجہان کو سنایا گیا

چیست دانی بادۂ گلگون مرصّنا جوہرے | حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

شاہجہان نے ام الخبائث شراب کی یہ توقیر اپنے مذہب میں پسند نہیں کی، اور فوراً شیدا کو شہر بدر کرنے کا حکم جاری کیا، شیدا نے اپنی برأت کے لیے ملا جامی کا مندرجہ ذیل شعر استشہاد مین پیش کیا،

از صراحی و دو یار قلقل مے | پیش جامی به از چہار قل است

پھر ایک طویل قطعہ معذرت مین لکھا جس کے کچھ اشعار یہ ہین:

جہان پناہا شاہا بقیہ [illegible] جلال | نیافرید خدا چون ترا عدیل و نظیر

بوصف مے زده سر از من این مصرعۂ [illegible] | که گشته ورد زبان ہمہ صغیر و کبیر

اگرچہ لفظش عام است معنیش خاص است | بخاص و عام بود شہرۂ ہمچو بدر منیر

چنین که تیکش اسرار مولوی جامی | کہ ہست گفتۂ او دور از در تقصیر

بوصف مے ز صراحی و دو بادہ قلقل مے | به از چہار قلش گفت و فارغ از تکفیر

مرا بہ کفر چہ نسبت بود کہ بہ [illegible] | [illegible] بضمیر

مرا چو شاہ براند کجا توانم رفت | بگاه راندن از کف کجا رود شمشیر[لہ]

اس قطعہ کے [illegible] شاہجہان نے [illegible] معاف کر دیا [illegible] آخر عمر مین وہ کشمیر مین گوشہ نشین ہو گیا تھا، جہاں اس کو شاہجہان کی طرف سے [illegible] یادگار مین ایک مثنوی

لہ کلمات الشعرا سرخوش

موسوم بہ دولت بیدار اور ایک دیوان بھی چھوڑا، دیوان مین ایک لاکھ اشعار تھے، مرزا محمد طاہر نصرآبادی اپنے تذکرہ مین اس کے کلام کی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے:

"خیالش غریب وافکارش لطیف است، شعر بسیاری گفتہ (ص۴۴۴)

غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام جلد دوم (ص۲۵) مین تحریر فرماتے ہین:

"صاحب ذہن رسا و فکر آسمان پیما بود شعر را بسرعت تمام می گفت، وبچشم زدن جواہر فراوان می سفت"

مگر خود شیدا کے معاصر منیر لاہوری نے اس کے کلام کی ہجو کی ہے،

شیدا گوید کہ شعر من لک بیت است ہر نقطۂ من بصفو بے شک بیت است
یک بیت درست نیست در دیوانش از جفت بروت صاحب لک بیت است[1]

یہ ہجو شاید اسی افراتفری کا نتیجہ ہے جس مین خود شیدا بھی مبتلا تھا، مرأۃ الخیال کے مولف کا بیان ہے کہ شیدا بہت ہی ذی استعداد شاعر تھا، علم عروض مین اس کی مہارت کاملہ ضرب المثل تھی، وہ ایسے شعرار کو خاطر مین نہین لاتا تھا، جو مقبول خاص و عام تو ہوتے تھے مگر فن شاعری سے بیگانہ تھے، ان کے کلام کے عیوب و نقائص کو بہت بے باکانہ طریقہ سے آشکارا کرتا تھا، اسی لیے اس کی بھی ہجو کہی گئی،

شاہجہانی دربار کے شعرا، مین حکیم حاذق گیلانی کی رعونت اور خودپسندی مشہور تھی، وہ حکیم ہمام گیلانی کا لڑکا تھا، اس لیے وراثت مین طبابت اور امارت کے علاوہ علم و ادب کا بھی ذوق پایا، شاہ جہان نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر اس کو منصب ہزارہ پانصداری شش صد سوار عطا کیا، اور اسی سال والیٔ توران کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہان سے واپسی کے بعد اس کو

[1] ید بیضا ص۶۳

اور دونوں طاؤس کے درمیان ایک درخت نصب کیا گیا تھا، جو لعل، الماس، زمرد اور مروارید سے مرصع تھا، تخت پر چڑھنے کے لیے تین پائے کی ایک سیڑھی بنائی گئی تھی جو جواہرات سے آراستہ تھی تخت کے گرد تکیہ لگانے کے لیے گیارہ مرصع تختے تھے جن میں سے درمیان کا تختہ جس پر بادشاہ ہاتھ رکھ کر تکیہ لگا کے بیٹھتا تھا دس لاکھ روپے کی قیمت کا تھا، اور ان میں ایک لعل تھا جس کو شاہ عباس صفوی نے تحفۃً جہانگیر کی خدمت میں بھیجا تھا، اس پر پہلے امیر تیمور، مرزا شاہ رخ، مرزا الغ بیگ کے نام کندہ تھے، شاہ عباس نے بھی اس پر اپنا نام لکھوایا، پھر جہانگیر نے اپنا اور اکبر کا نام کھدوایا، اس کے بعد شاہ جہان نے اپنا نام کندہ کرایا، عالمگیر کے اوائل دور حکومت میں اس تخت کی ترصیع و ترتیب میں اور اضافہ کیا گیا[۱]، بے بدل خان نے جب اس کو تیار کیا تو شاہ جہان نے خوش ہو کر بے بدل خان کو روپے میں تلوایا، اور جب آٹھویں سال جلوس کے جشن میں شاہجہاں اس پر جلوہ افروز ہوا تو تمام شعراء نے قصیدے، نظمیں اور مثنویاں پیش کیں، حاجی محمد جان قدسی نے اس کی تاریخ اورنگ شاہنشاہ عادل نکالی. قدسی کی اس مثنوی کے کچھ اشعار یہ ہیں

زہے فرخندہ تخت پادشاہی — کہ شد سامان بتائید الٰہی

فلک روزے کہ میکردش مکمل — ز خورشید را بگداخت اول

بحکم کار فرما صرف شد پاک — بمینا کاریش مینائے افلاک

جز این تخت از زر و گوہر چہ مقصود — وجود بحر و کان را حکمت این بود

ریا قوتش کہ در قید بہا نیست — لب لعل بتان را دل بجا نیست

برائے پایہ اش عمرے کشیدہ — گہر افسر بسر خاتم بدیدہ

بجز جشن عالم از زر شد چنان پاک — کہ شد از گنج خالی کیسۂ خاک

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھو بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۸۰-۱۰، مآثر الامرا جلد اول ص ۲۳۲

عرض مکرر کی خدمت تفویض کی گئی، اور سہ ہزاری منصب دیا گیا، کچھ دنون کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی، مگر اس زمانہ مین بھی شاہی خزانہ سے بیس ہزار اور پھر بعد مین چالیس ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا، کچھ دنون درباری مورخون کے ساتھ اس عہد کی تاریخ لکھنے مین بھی شریک رہا، اس کے اشعار صاف اور پاکیزہ ضرور ہوتے تھے، مگر اپنی خود بینی کی بنا پر اپنے کو انوری سے بھی بہتر تصور کرتا تھا، اپنے دیوان کو بڑی زینت و آرایش کے ساتھ لکھوا کر ایک مرصع طشت پر رکھتا تھا، اور جب کسی مجلس مین جاتا اور عمائدین سلطنت اس کی تعظیم کے لیے نہ اٹھتے تو برہمی کا اظہار کرتا دیوان کو ایک مطلا رحل پر رکھ کر اپنا کلام سناتا تھا، اس کے اس شعر کی داد تو آج بھی دی جا سکتی ہے

دلم ہیچ تسلی نمی شود حاذق ۔۔۔ بہار دیدم و گل دیدم و خزان دیدم[۱]

کچھ اور بھی سنیے

بوئے گل امشب ز دود شمع می آید مگر ۔۔۔ بلبل اٹھکے بر سر خاکستر پروانہ ریخت

زبہر تسبیح دستم عار دارد ۔۔۔ کہ سبحہ بر میان زنار دارد

من آن تسبیح را بر دست گیرم ۔۔۔ کہ او ذاکر بود گر من بمیرم[۲]

سعیدائی گیلانی شاعر بھی تھا اور اعلیٰ قسم کا صناع بھی، اس کو زرگری مین غیر معمولی کمال حاصل تھا، اسی لیے شاہجہان نے اس کو زرگر خانہ کا داروغہ مقرر کیا، اور بے بدل خان کا خطاب دیا، شاہجہانی عہد کا سب سے بڑا صنعتی کارنامہ تخت طاؤس اسی کے ہاتھون انجام پایا، یہ ایک کروڑ روپے کی لاگت سے سات سال مین تیار ہوا، اس کا طول سوا تین گز، عرض ڈھائی گز بلندی پانچ گز تھی، اس تخت کے اندرونی حصہ مین زیادہ تر مینا کاری کا کام اور کچھ حصہ مرصع تھا، چھت کے بیرونی حصہ مین لعل و یاقوت جڑے ہوئے تھے، اور اس کو زمرد کے بارہ ستون پر قائم کیا گیا تھا، چھت کے اوپر دو مرصع طاؤس بنائے گئے تھے،

---

[۱] مآثر الامرا، جلد اول ص ۵۹۰، [۲] تذکرۂ نصر آبادی ص ۶۲

رساند گر فلک خود را بپایش | دہد خورشید و مہ را زو بہائش
سرافرازی کہ سر بر پایہ اش شود | ز گردون پایۂ بر تخت افزود
اثر باقیست تا کون و مکان را | بود بر تخت جا شاہ جہان را
بود تختی چنین ہر روز جایش | خراج ہفت کشور زیر پایش
چو تاریخش زبان پرسید از دل | بگفت اورنگ شاہنشاہ عادل[1]

اس جشن مین ابو طالب کلیم، سلطان شادمان اور دوسرے شعراء نے بھی قصیدے کہے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، خود سعیدای گیلانی نے ۴۳ شعر کا ایک قصیدہ کہا جس کے مختلف اشعار سے شاہجہان کے مختلف واقعات سلطنت کی تاریخین نکلتی تھین، اسکے کچھ حصے یہ ہین:-

خدائے واحد بیچون جہان نمود عیان | برائے شاہجہان بادشاہ کل جہان
بداد وجود باحسان شہنشہ آفاق | علیم و عالی و دانواز و ملک ستان
ہزار سال بمانا و آنکہ ہر دم ازو | بود بدور جہان صد ہزار جان شادان
بمدح شاہ جہان طبع این دوازدہ بیت | ز قسمت ازل اورا ز دلم بزبان
ازان دوازدہ ہر مصرعی نگاہ نگار | کند تولد شاہ جہان پناہ بنان
باکبر آباد از جہد کامران بسریر[1] | جلوس کرد ز تائید عالمبان
ہزار بود و چہل و سہ بسال از ہجرت | کہ تندید بلی بادشاہی و سپاہ گران
بنو بہار بسیار یہ گلشن سر ہشت | گل بہار آید یا ہوا چو گل خندان
ز کامرانی نوروز عزم کردہ نمود | سوی مدینہ لاہور بر جہان شادان
ہزار گونہ لالہ گل بکوہ ہر قدمش | ہزار چشمۂ دولی ز چشمۂ حیوان

[1] مصرعہ ناقص معلوم ہوتا ہے، مگر اسی طرح منقول ہے۔

بسوی ہند عنان زد وتاب شد باجاہ | جہاندہ برق نما برشتے چو باد وزان
بداد وجود بدار الخلافہ آمد باز | فلک بدور رکاب وملک بدر عنان
ہزار شکر بیفزود باز حسن جہان | ز نوبہار سریر جواہر الوان
بہر زمین کہ از آن سایہ فتاد فلک | بداد تا باید دستگاہ پایۂ کان
جمال ورنگ ز اورنگ بادشاہ زمن | بداد گیتی صد رنگ بر زمین زمان
خدیو ملک و ملل بادشاہ دین و دل | جہان کشاد با مداد قوت ایمان
جہان پناہا شاہنشہی و دریا دل | محیطی از کرم وجود لیک بے پایان
ز سہم گرز وسنانت دل عدو جاوید | شود ہزیر زمین چو رگ جہندہ طپان
از ان بود سر دشمن بزنگ سنگ سیاہ | کہ از برائے حسامت بود مدام فسان[1]

عبد الحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ (جلد اول حصہ دوم ص ۳۵۶) میں سعیدائی گیلانی کی شاعری کی بڑی ستایش کی ہے، لکھتا ہے:

"از رسائی طبع وروانی فکر اکثری بنظم معانی می پردازد. لفظش ہموارہ دلنشین است، ومضامین نو آئینش،

اور مثال کے طور پر بہت سے اشعار نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک غزل کے شعر ہم بھی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

سوارہ آن مہ زرین رکاب می آید | بچہرہ اشک ہزار آفتاب می آید
بآب تیغ تو دل می کشد ز آب حیات | چو تشنہ کو سوی آب از سراب می آید
کند عرق رخنت اے نازنین ز تاب نگاہ | بدور حسن تو از آتش آب می آید

---

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۹۲-۹۰

تو مست مے و من مست عشق چیست حجاب / چنین دوستی کے از شراب می آید

شعراء کے ساتھ شاہجہان کی زرپاشیون کی مثالین بکثرت ملین گی، میر یحیی کاشی نے شاہجہان آباد کی تعمیر کی حسب ذیل تاریخ کہی،

شد شاہجہان آباد از شاہجہان آباد
۱۰۸۵

تو شاہجہان نے پانچ ہزار روپے انعام دئیے، سنہ ۱۰۵۹ھ مین ایک موقع پر شاہجہان نے اسکو ایک سو اشرفیان عنایت کین۔ کلمات الشعراء مین ہے کہ اس نے شاہجہان کے حکم سے بادشاہ نامہ کو منظوم کرنا شروع کیا، اس مین ایک شعر کہا کہ

سر راجپوتان جگت سنگہ بود / کہ بر شیشۂ فلک سنگ بود

شاہجہان نے اعتراض کیا کہ جگت سنگہ کو اسکی حیثیت کے لحاظ سے سر راجپوتان کہنا صحیح نہین، پھر سنگہ اور سنگ کا قافیہ بھی درست نہین، یحیی نے جواب دیا کہ ہم مغل اس قسم کے الفاظ کی تفریق نہین کر سکتے۔

مرزا رضی دانش مشہدی ہندوستان کے بادشاہون کی فیاضی سنکر وطن سے چلا تو اس ملک کے اشتیاق مین اس نے یہ شعر کہا:

راہ دور است و پا بستۂ وطن دارد مرا / چو حنا شب درمیان رفتن بہندوستان خوش است

اس کے کلام کی صفائی، شیرینی اور دلآویزی مشہور تھی، شاہجہان کے دربار سے وابستہ ہوا تو اس نے سنہ ۱۰۶۰ھ مین ایک قصیدہ پیش کیا جس کا ایک شعر یہ ہے:

بخوان بلند کہ تفسیر آیۂ کرم است / خطے کہ کف دست مبارکش پیداست

شاہجہان نے اس پر دو ہزار روپے عنایت کئے، دارا شکوہ اس کا سرپرست اور مربی

۱؎ مآثر الامراء جلد سوم ص ۴۹۶ ۲؎ بادشاہنامہ جلد دوم ص ۵۹۶ ۳؎ کلمات الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

رہا، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، کچھ دنون شاہزادہ شجاع کے دربار مین ملازمت کی، اور عبد اللہ قطب شاہ والی حیدرآباد دکن کے خوان کرم کا بھی ریزہ چین ہوا،[1]

مرزا حسن بیگ رفیع قزوینی کچھ دنون مشہد مقدس مین حصول سعادت کے لیے مقیم رہا اس لیے نام کے ساتھ مشہدی بھی لکھا جاتا ہے، نذر محمد خان والی بلخ کے دربار مین ملازم رہنے کے بعد ۱۰۵۴ھ مین ہندوستان آیا، شاہجہان کی خدمت مین باریاب ہوا تو خلعت اور تین ہزار روپے ملے، اور شاہی ملازمون مین داخل کر لیا گیا، ۱۰۶۶ھ کے جشن جلوس پر ایک مثنوی کہی تو ایک ہزار روپیہ انعام پایا، شاہجہان نے اس کو منصب پانصدی بھی عطا کیا،[2] عالمگیر کے زمانہ مین کشمیر کا دیوان بیوتات مقرر ہوا تھا، اس کو شعر و شاعری مین بڑی شہرت حاصل تھی، اپنے اس شعر پر فخر کرتا تھا،

عمر گر خوش گذرد زندگی خضر کم است   در بنا خوش گذرد نیم نفس بسیار است

میر معز موسوی خان نے اعتراض کیا کہ بنا خوش صحیح نہین یا تو ناخوش ہونا چاہیے یا ناخوشی، مرزا رفیع نے بادل ناخواستہ "بہ تلخی گذرد" بنا دیا، مگر خود کہتا تھا کہ شعر کا مزہ جاتا رہا،[3] کلمات الشعراء مین ہے کہ اس نے شاہجہان آباد پر ایک مثنوی بھی لکھی، تخت مرصع کی تعریف مین کہتا ہے:

اگر پاسبانش شود مست خواب   بہ دریش فشاند ز یاقوت آب

شاہی عمارت کی تعریف کرتا ہے:

خدا رفعتش را بجائی رساند   کہ آتش ز ہمراہی سنگ ماند

میر صیدی طہرانی، اصفہان سے ہندوستان آیا، اور ۱۰۶۵ھ مین شاہجہان کی ملازمت مین داخل ہوا، تو ایک قصیدہ شاہی خدمت مین پیش کیا، جس کا مطلع یہ ہے

---

[1] مآثر الکرام حصہ دوم ص ۸۸-۸۷۔ [2] ایضاً، [3] کلمات الشعراء قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

زہے جہانِ خدا را سپہر عدل و کرم | بزیر سایۂ قدرِ تو نیرِ اعظم

شاہ جہان نے اس کے صلہ مین ہزار روپے دیے، اس نے شاہجہان کی شان مین بہت سے قصائد کہے، سرخوش نے کلمات الشعرا مین اس کو نازک خیال، بلند فکر، استاد فن اور کامل سخن کہا ہے، دیوان کے علاوہ کشمیر پر ایک مثنوی بھی لکھی ہے، کلام کا نمونہ یہ ہے:

مارا بہ برگ سبز کجا یاد می کند | آن گل کہ منع بوی خود از باد می کند

صیاد ما بنا ہی تازہ کردہ است | مرغی کہ پر شکستہ شد آزاد می کند

سوخت رشک شعلہ شمعم کہ در راہ طلب | از نظرہا کردہ پنہان جادۂ پیمودہ را

در بزم او مجال نشستن نیافتیم | چون نرگس ایستادہ کشیدیم جام را

غباری وا روہ از خط ماہ رخسارش کہ گر یکجا | مصور جمع سازد صورت خالی نمی گردد

عماد، فتحا، عسکری کاشانی، کیفی نومسلمان، اور ادہم مرزا وغیرہ نے بھی شاہجہان کے جود وسخا سے جلب منفعت کیا، ہم ان کی تفصیل بیان کرنے سے اس لیے گریز کرتے ہین کہ ہم تیموری دربار کے شعرا، کا کوئی تذکرہ لکھنا نہین چاہتے، صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ تیموریون کی بزم مین ارباب سخن کی کیا قدردانی اور حوصلہ افزائی ہوئی، اور اس شاہانہ سرپرستی مین ان کا انداز کلام کیا رہا،

ہندو شعراء شاہجہانی عہد کا سب سے ممتاز ہندو شاعر اور ادیب چندر بھان برہمن تھا، لاہور مین پیدا ہوا، شروع مین میر عبد الکریم میر عمارت لاہور کے یہان ملازمت کی، پھر امیر الامرا افضل خان دیوان کل کے دربار مین ملازم ہوا، شاید اس کی سرکار کا دیوان مقرر ہوا، افضل خان کی وفات کے کے بعد شاہجہان کے ایک امیر عاقل خان کی وساطت سے دربار مین پہنچا، اور خط شکستہ مین ایک رباعی

لے اسلامک کلچر اپریل سنہ ۱۹۲۹ء اس مضمون مین چہار چمن کا ایک اقتباس دیکر یہ بتایا گیا ہے کہ چندر بھان برہمن ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کا شاگرد تھا،

لکھکر شاہی خدمت مین پیش کی،

شاہے کہ مطیع او دو عالم گردد   ہر جا کہ سریست پیش او خم گردد
از بسکہ بدورش آدمی یافت شرف   خواہد کہ شرف نیز آدم گردد[1]

شاہ جہان نے اس کو وقائع نویسی کے عہدہ پر مقرر کیا، اس عہدہ پر برہمن فخر کرتا تھا کیونکہ وہ روزانہ بارگاہ شاہی مین حاضر ہوکر ہر روز کے واقعات و حالات سناتا تھا، شاہ جہان نے بھی اس کے فرائض منصبی سے خوش ہوکر ایک ہاتھی انعام مین عطا کیا تھا، بعض سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے اودے پور کے رانا کے پاس بھی بھیجا گیا، اسی زمانہ مین چہار چمن لکھکر نو روز کے موقع پر سرہند مین بادشاہ کی خدمت مین گذرانی، اس مین برہمن کے ذاتی احوال و کوائف کے علاوہ شاہی دربار کے مختلف جشنون، اس کی شان و شوکت، بادشاہ کے روزانہ معمولات اور شاہجہان آباد اور دوسرے شہرون اور صوبون کا ذکر ہے، داراشکوہ برہمن کی نظم و نثر دونون کا مداح تھا، اس لیے اس کو اپنا میر منشی مقرر کیا، دارا جب قندھار کی مہم پر گیا تو برہمن بھی اس کے ساتھ تھا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ علامی سعد اللہ خان کی وفات کے بعد برہمن پھر دربار شاہی سے منسلک ہوا اور دفتر شاہی کا میر منشی مقرر ہوا ، اور رائے کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا ، عالمگیر تخت پر جلوہ افروز ہوا تو اس کی تخت نشینی پر یہ رباعی کہی،

شاہا عالم مطیع فرمان تو باد   ہر زیر ادائے شکر احسان تو باد
چون ذات تو خلق را نگہبان باشد   ہر جا باشی خدا نگہبان تو باد

برہمن دارا کا حامی تھا، اس لیے ایک خط مین برہمن نے اورنگ زیب سے یہ شعر لکھکر اپنے قصورون کی معافی مانگی،

شدیم پیر بعصیان و چشم آن داریم   کہ جرم ماجوانان پارسا بخشد

[1] ارشاد ... ص ۱۸۳

عالمگیر کے زمانہ مین وہ جہانگیر کے مقبرہ کی نگرانی کے لیے مامور کیا گیا تھا[۱]، برہمن صاحب دیوان بھی تھا، اور دارا سے اپنی شاعری کا خراج تحسین برابر حاصل کرتا رہا، شاہی دربار کی حوصلہ افزائی کی بنا پر برہمن نے اپنا دیوان ایران بھیج کر وہان کے ارباب فن سے بھی داد طلب کرنے کی کوشش کی، چنانچہ اپنے دیوان کے کچھ نسخے بھی وہان بھجوائے، مگر ایرانی جب ہندستان کے بڑے بڑے ارباب کمال کی ستایش کرنا اپنے لیے کسر شان سمجھتے تھے تو برہمن کو کب خاطر مین لا سکتے تھے لیکن سرخوش نے کلمات الشعرا مین اس کی تعریف کی ہے،

"طبعی درست داشت، شعر بطور قدما شستہ و صاف می گفت و سلیقہ انشا پردازی نیز داشت، در ہندوان غنیمت بود"

غلام علی آزاد بلگرامی نے سرو آزاد اور ید بیضا مین اس کا ذکر نہین کیا ہے، مراۃ الخیال کے مولف نے برہمن کے لیے اچھے الفاظ استعمال نہین کئے ہین، مگر اس کی یہ غزل پسند کی ہے:

کنم ز سادہ دلی بند دیدہ مژگان را — بہ مشت خس نتوان بست راہ طوفان را

جگر فشان شدم باز جائے آن دارد — کہ لالہ زار کنم دامن و گریبان را

ہمیشہ زلف ترا اضطراب در کار است — چگونہ جمع کند خاطر پریشان را

شبے خیال تو آمد بخواب و آسودیم — دگر ز ہم نکشادیم چشم گریان را

برہمن از تو سخن بے دلیل می خواہم — کہ اعتبار نباشد دلیل و برہان را

منشآت برہمن چندر بھان کے رقعات کا مجموعہ ہے، عرصہ دراز تک مدارس مین زیر درس رہی، اور یہ اس کی نثر نگاری کی مقبولیت کی دلیل تھی، اس کی اور تصانیف کے نام یہ ہین، گلدستہ، تحفۃ الانوار، کارنامہ، تحفۃ الفصحا، مجمع الفقرا، اور تحفۃ الوداد،

---

[۱] اسلامک کلچر اپریل ۱۹۴۵ء

اکبر و جہانگیر کی طرح شاہجہان بھی ہنود اہل کمال کی برابر سرپرستی کرتا رہا، ۱۰۶۱ھ میں ایک ہندی شاعر نے اس کے نام پر ایک کبت کہی تو اس کو دو ہزار روپے اور ایک ہاتھی مرحمت کیا،[1] ہندی شعراء میں سندر، اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اس کی تصانیف سندر سنگار، اور سنگھاسن بتیسی برج بھاشا میں مشہور ہیں، ہندی کے مشہور شعراء چنتا منی اور راجہ شمبھو ناتھ سنگھ بھی اس کے دربار سے منسلک رہے، چنتا منی سہتا یعنی ترکیب نظم کا استاد تھا، راجہ شمبھو ناتھ نے شاہجہان کی فرمائش پر کوندا الکلپ لتا لکھی، اس کتاب میں شاہ جہان، دارا شکوہ اور جہان آرا پر مدحیہ نظمیں ہیں،[2] ایک بار یمین الدولہ نے ترہت کے دو برہمنوں کو دربار میں پیش کر کے عرض کیا کہ یہ دونوں دس ہندی کبتیں جو دس شاعروں نے تازہ کہی ہوں اور کسی نے نہ سنی ہوں ایک بار سنکر یاد کر لیتے ہیں اور اسی وزن اور مضمون میں دس شعر فی البدیہہ کہہ دیتے ہیں، امتحان ہوا تو سچ ثابت ہوا، شاہجہان نے دونوں کو خلعت اور ہزار ہزار روپے انعام دیئے،[3]

امراء

امراء جب کسی عہدۂ جلیلہ پر مامور کئے جاتے تو اس کا خیال رکھا جاتا تھا، کہ وہ نہ صرف سیاسی نقطۂ نظر سے پختہ کار اور بیدار مغز ہوں بلکہ مختلف علوم و فنون میں بھی ان کو امتیازی حیثیت حاصل ہو شاہجہان کے خسر یمین الدولہ خانخانان **آصف خان** سپہ سالار کو ہر قسم کے علوم خصوصاً معقولات میں بڑی درک حاصل تھا، اس کے القاب کا جز "شعلہ افروز فطرت اشراقیان، دانش آموز طبیعت مشائیان" تھا خوش بیان، خوش نویس اور اعلیٰ قسم کا سیاق دان بھی تھا،[4]

شاہ جہان کے دیوان کل **افضل خان** علامی شکر اللہ شیرازی کا شمار جید علماء میں کیا گیا ہے، جب وہ دیوان کل کے عہدہ پر فائز ہوا، تو کسی نے تاریخ کہی: ع شد فلاطون وزیر اسکندر ۱۰۳۸

---

[1] خافی خان ج ۱ ص ۷۰۶، [2] کی ہسٹری آف ہندی لٹریچر، [3] بادشاہ نامہ حصہ دوم ص ۲۶۹،

[4] مآثر الامراء جلد اول ص ۱۵۸،

معقولات، منقولات، ہیئت، ہندسہ اور حساب مین اس کی اعلیٰ قابلیت مشہور تھی، فصاحت مین حسان وقت کہلاتا تھا، شاہ جہان کہا کرتا تھا کہ افضل خان کی زبان سے کسی نے کوئی برا کلمہ نہین سنا۔[1]

سعد اللہ خان، کو عبد الحمید لاہوری بادشاہ نامہ مین علامۃ الوریٰ اور فہامۃ العصر لکھتا ہے وہ معقولات و منقولات کا ممتاز عالم ہونے کے علاوہ حافظ قرآن بھی تھا، اس کی تقریر کی فصاحت اور تحریر کی بلاغت کی بھی بڑی شہرت تھی، دربار مین پہنچکر اس نے جس طرح رسوخ و اقتدار حاصل کیا، اس کا ذکر عمل صالح مین اس طرح ہے،

رمضان ۱۰۵۰ھ مین موسوی خان صدر کل کی سفارش سے بادشاہ کے حضور مین (سعد اللہ خان نے) شرفیابی حاصل کی، پہلی مجلس ہی مین بادشاہ کی کمال شناسی اور قدر دانی کی وجہ سے اس کی استعداد کا مرتبہ نمایان ہوگیا، اور بادشاہ کی دقیقہ رسی کے باعث اس کا کمال ظاہر ہوا، اس کی (یعنی سعد اللہ خان کی) دقت طبع، حدت فہم، کثرت فراست، استنباط دقائق، دریافت حقائق، اور تحصیل علم وہبی و کسبی وغیرہ کا حال اہل علم پر ظاہر ہوگیا، چونکہ بادشاہ شریعت کی ترویج، اکابر دین کی تقویت، علما و صلحا کی تعظیم و تکریم، طلبہ کی تربیت و اہتمام مین ہمیشہ رغبت ظاہر کرتا ہے، اس لیے اس کی خاص مہربانی کی وجہ سے جس مین آب حیات کی خاصیت ہے، اس نے (یعنی سعد اللہ خان نے) حیات جاودان پائی، مناسب روزینہ خلعت اور گھوڑے سے سرفراز ہوکر ملازمان شاہی کے زمرہ مین منسلک ہوا، اور بادشاہ کے حسن تربیت اور اس کی مہربانی کی برکت سے ایک سال مین ایک ہزار دو سو سوار کا منصب خان کا خطاب، عرض مکرر کی خدمت اور غسل خانہ کی داروغگی کا عہدہ عطا ہوا، روز بروز اس کا

---

[1] مآثر الامرا، جلد اول ص۱۵۱ و بادشاہ نامہ ج ۱ حصہ دوم ص۳۳۹، و ج ۲ ص۵۵۔

اقبال بڑھتا گیا، بادشاہ کی نظر عنایت نے اس کی ذاتی استعداد کی مدد کی، اور اس کی سعادت کا ستارہ قابلیت اور اقبال کے مشرق سے کمال کے مطلع پر نکلا، رفتہ رفتہ بادشاہ کی خاص مہربانی سے اس نے اس قدر ترقی کی کہ دوسرے سال تین ہزار منصب، دو ہزار سوار اور خانسامانی کی خدمت سے سربلند ہو کر انجمن مین ہمدم و دمساز اور خلوت مین محرم و ہمراز ہو گیا، اور چوتھے سال بادشاہ کے فیض تربیت سے اس کے اقبال کا درخت طوبی کی طرح بڑھکر ہندوستان کی وزارت کے باغ کا زینت ہوا، اور ساتوین سال ہفت ہزاری ہفت سوار پنجہزار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب، دس کرور دام کا انعام، اور علامی و فہامی کا خطاب ملا"

(جلد دوم ص ۳۳۷، ترجمہ آزاد ہے)

محمد امین میر جملہ شہرستانی شاعر بھی تھا، امیر الامرا علی مردان خان کے دربار کی علم پروری مشہور تھی، نواب قاسم خان، ظفر خان احسن، عنایت خان آشنا، اور مرزا امان اللہ امانی کا ذکر پہلے آچکا ہے،

فضلا،

ملا عبد الحکیم سیالکوٹی. ان کے بارہ مین آزاد بلگرامی رقمطراز ہین :

اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم اور اس زمانہ کے لوگون کے لیے موجب افتخار ہین یقیناً تمام درسی علوم مین ہندوستان کی سرزمین سے ان کا ہمسر نہین پیدا ہوا، اور کمیت و کیفیت اور حسن قبول مین استد علمی یادگارین انکی طرح کسی نے دنیا مین نہیں چھوڑیں، سیالکوٹ جو لاہور کے مضافات مین ہے ان کا مولد ہے اور وہین ان کی نشو و نما ہوئی جب ان کے سن شعور کا آغاز ہوا تو طالب العلمی شروع کی، اور زیادہ تر ملا کمال الدین کشمیری سے جو سیالکوٹ مین رہتے تھے فیض حاصل کیا، اور تھوڑی سی مدت مین بدر کامل ہو کر چمکے اور دنیا کو اپنے علمی فیوض و برکات سے بھر دیا. جہانگیر کے زمانے مین ضروری معاش پر قناعت کر کے اپنے

وطن ہی مین زندگی بسر کی لیکن جب شاہ جہان کا زمانہ آیا اور علما و شعرا کی گرم بازاری ہوئی تو وہ اس کے دربار مین حاضر ہوئے، اور جب جب دربار مین باریابی حاصل کرتے تھے صلۂ گران پاتے تھے، دو مرتبہ روپے مین تولے گئے اور وزن مین جس قدر روپیہ چڑھا ان کو مل گیا،[۱] اور چند گاؤن بطور جاگیر کے انعام مین پائے، اب وہ نہایت اطمینان و فارغ البالی کے ساتھ اپنے وطن مین مقیم رہ کر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے علم کی اشاعت کرنے لگے، اونکی تصنیفات عرب و عجم مین پھیلی ہوئی ہین، اور وہ یہ ہین، حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ مقدمات تلویح، حاشیہ مطول، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ شرح عقائد تفتازانی، حاشیہ حاشیہ خیالی، حاشیہ شرح شمسیہ، حاشیہ حاشیہ عبد الغفور، تکملہ حاشیہ عبد الغفور، حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی، درۂ ثمینہ در اثبات واجب تعالیٰ، حواشی درکنار حکمۃ العین، حواشی درکنار شرح ہدایۂ حکمت، حواشی درکنار مراح الارواح، ۲۰ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ مین وفات پائی، اور سیالکوٹ مین مدفون ہین، (مآثر الکرام دفتر اول ص ۲۰۵)

ملا محمد فاضل، بدخشان کے رہنے والے تھے، کابل، توران، اور شیراز سے علم معقول و منقول حاصل کر کے ہندوستان آئے، تفسیر اور اصول کی تعلیم ملا جمال لاہوری سے حاصل کی، اپنی لیاقت کے سبب "عدالت اردوئے گیہان" سے وابستہ ہوئے، آخر عمر مین درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، شاہجہان کی طرف سے وظیفہ مقرر تھا۔ (بادشاہ نامہ، عبد الحمید لاہوری ص ۳۴۳ ج ۱ حصہ دوم)

عبد السلام دیوی، معقول منقول، فقہ اور اصول فقہ مین مہارت تامہ رکھتے تھے، شاہی فوج کیسا تھ منسلک تھے،

قاضی محمد اسلم۔ ہرات مین پیدا ہوئے، مگر کابل مین سکونت اختیار کی، خراسان کے مشہور

---

[۱] مزید تائید کے لیے دیکھو بادشاہ نامہ ج ۱ حصہ ۲ ص ۲۴۱

بزرگ مولانا خواجہ کوہی کی نسل سے تھے، جہانگیر کے عہد مین لاہور آئے، اور یہان شیخ بہلول کے حلقۂ درس مین شریک ہوئے، پھر اکبر آباد پہنچے، اپنے عزیز مولانا میر کلان محدث (بنبیسہ مولانا خواجہ کاہی) کی وساطت سے جہانگیر کے دربار مین باریابی حاصل کی، جہانگیر نے ان کی دین داری اور پرہیزگاری سے متاثر ہو کر، کابل کا منصب قضاء تفویض کیا، اس کے بعد جہانگیر ہی کے عہد مین شاہی لشکر کے قاضی ہوئے، شاہجہان نے ان کو اپنے زمانہ مین بھی اسی عہدہ پر مامور رکھا، اور منصب ہزاری عطا کیا، اس خدمت کو ۱۵ سال تک انجام دیتے رہے، شاہجہان ان کی بڑی قدر کرتا تھا، اس نے اپنا امام خاص بھی بنایا تھا، ۱۰۵۲ھ مین ان کو روپے مین تلوایا، جو وزن مین ساڑھے چھ ہزار تھے، ایک بار گھوڑے سے گر گئے، تو چار مہینے صاحب فراش رہے، شفا پائی تو کابل گئے، شاہجہان نے دس ہزار روپے انعام مین دیے، ۱۰۶۱ھ مین وفات پائی، مزار لاہور مین واقع ہے، ان کے لڑکے میر محمد زاہد بھی جید عالم تھے، شاہجہان نے کابل مین واقعہ نویس کے عہدہ پر مامور کیا، عالمگیر کے زمانہ مین شاہی لشکر کے محتسب رہے، پھر کابل کی صدارت تفویض کی گئی، ۱۱۰۱ھ مین کابل مین عالم جاودانی کو سدھارے، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ شرح تہذیب علامہ دوانی، حاشیہ تصور و تصدیق ملا قطب الدین رازی، اور حاشیہ شرح ہیاکل ان کی تصانیف ہین ان کی ایک اور تالیف رسالہ میر زاہد، معقولات مین درس نظامی کی اونچی کتاب سمجھی جاتی ہے، (مآثر الکرام جلد اول ص ۲۰۷-۹ و بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۳۴۳)

قاضی محمد سعید کرہرودی، کچھ دنون تک داروغۂ داغ رہے، پھر "عرض مکرر" کی خدمت انجام دی، آخر مین بیوتات کے دیوان تھے، ہزاری منصب پر فائز تھے،

ملا میرک شیخ ہروی، ہرات سے ہندوستان آئے، پھر مکہ معظمہ گئے، وہان حدیث

کی تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آئے، تو شاہجہان نے داراشکوہ اور مراد بخش کی تعلیم کے لیے مقرر کیا،

ملا **عبداللطیف** سلطانپوری، تقریر و تحریر اور علمی تحقیق مین یگانۂ روزگار تھے، داراشکوہ اور اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے مقرر تھے، آنکھون کی بصارت جاتی رہی، تو شاہجہان نے چند مکانات ان کو بطور انعام دیے، اور اجازت دی کہ وطن جاکر علوم دینیہ کا درس دین،

میر محمد **ہاشم** گیلانی، معقولات، منقولات، طب اور ریاضی کے عالم تھے، بارہ سال حرمین شریفین مین رہ کر تعلیم پائی، منقولات مین شیخ محمد عربی محدث، شیخ عبدالرحیم حسانی اور ملا علی ہیرہ ملا عصام الدین کے شاگرد تھے، اور معقولات مین میر نصیر الدین حسین اور مرزا ابراہیم ہمدانی سے تحصیل علم کی، طب حکیم علی گیلانی سے پڑھی، شاہجہان نے ان کی لیاقت کو دیکھکر تمام ملک کی "صدارت و طبابت" کی خدمت پر مامور کیا، پھر اورنگ زیب کی تعلیم انہی کے سپرد کی گئی، تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھکر شاہجہان کے نام معنون کیا،

شیخ **محمد**، اکبری عہد کے مشہور طبیب حکیم الملک کے پوتے تھے، مکہ معظمہ مین پیدا ہوئے وہان سے تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آئے، پرہیزگاری، نیک کرداری اور دوسرے فضائل سے متصف تھے، شاہجہان نے انھین دارالسلطنت کا میر عدل مقرر کیا۔[۱]

ملا **فرید** دہلوی، یمین الدولہ آصف خان کے حسن اہتمام سے ملا فرید دہلوی نے اور منجمون کی مدد سے ایک زیچ تیار کی جس کا نام زیچ شاہجہانی رکھا، اس مین زیچ الغ بیگ کے بعض مسامحات بھی دکھائے گئے ہین، شاہجہان کے سامنے جب یہ زیچ پیش کی گئی تو اس نے عام استفادہ کی خاطر ہندوستان کی زبان مین ترجمہ کے لیے حکم دیا۔[۲]

۱؎ مذکورہ بالا علماء کے حالات کے لیے دیکھو بادشاہ نامہ ج ۲ از عبدالحمید لاہوری ص ۳۴۶-۳۴۹،

۲؎ عمل صالح ج ۱ ص ۳۶۱،

میر محمد صالح شکین قلم، میر عبد اللہ زرین رقم کا لڑکا تھا، ایک کتاب مناقب مرتضوی لکھ کر شاہجہان کو گذرانی، شاہجہان نے چند ورق دیکھے، تو بہت پسند کی، پانچ ہزار روپے اور ایک ہاتھی انعام مین دیا،[1]

اس عہد کے اور دوسرے علماء و مشائخ کے نام یہ ہین، شیخ عبد الحق دہلوی، ملا یوسف، ملا عبد السلام لاہوری، مولانا محب علی، سید محمد رضوی، میان میر، سید جلال، خواجہ خاوند محمود، خواجہ اسحق دہبیدی، مجاز، ملا شاہ بدخشی، ملا خواجہ، شیخ بلاول قادری، شیخ پیر، میر حسام الدین بدخشی، شیخ ابو المعالی اور شیخ ناظر، ان کے فیوض و برکات کا ذکر عبد الحمید لاہوری کی تاریخ بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم مین ملے گا،

مورخین شاہان مغلیہ کو تاریخ سے خاص ذوق تھا، اس لیے ہر حکمران کے دور حکومت مین تاریخ نویسی کا باضابطہ محکمہ قائم تھا، شاہجہان نے اپنے عہد کی تاریخ نویسی کے لیے متعدد اہل قلم کی خدمات حاصل کین، چنانچہ اس کی فرمائش سے جو تاریخین مرتب ہوئین وہ مندرجۂ ذیل ہین،

۱- بادشاہ نامہ از محمد امین قزوینی،

۲- بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری،

۳- بادشاہ نامہ از محمد وارث،

۴- شاہجہان نامہ از مرزا جلال الدین طباطبائی،

محمد امین قزوینی، محمد امین بن ابو الحسین قزوینی ایران سے آکر پانچوین سنہ جلوس مین شاہجہانی دربار مین منشی کے عہدہ پر مامور ہوا، شاہجہان اپنے دربار کے تاریخ نویسوں کے کام سے خوش نہین تھا، وہ ایک لائق اہل قلم کی تلاش مین تھا، اتفاق سے قزوینی نے بندیلہ کی جنگ کے

[1] خافی خان جلد اول ص ۶۰۵،

حالات لکھکر پیش کئے، شاہجہان اس کی لیاقت سے خوش ہوا، ۱۰۴۵ھ یعنی سنہ جلوس مین قزوینی سے فرمایش کی کہ وہ اس کی پیدایش سے لیکر اس عہد تک کی ایک مفصل تاریخ لکھے، قزوینی نے ابتدائی دس سال کے احوال قلمبند کئے، دوسرے دس سال کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر نہ لکھ سکا، عمل صالح[۱] مین اسکی قابلیت و قابلیت کا ذکر ان الفاظ مین ہے:-

"مرزا امینا در اصطلاحات زبان فارسی مہارت تمام دارد و قاعدہ فن انشا را بقانون می شناسد، شاہد سخنش از لباس تکلف مبرا است و صاحب طبع و ذہن مستقیم و فکر رسا، سابق خدمت نگارش بادشاہ نامہ بدو متعلق بود و بعد ازان بخدمت جمع و تاریخ می پرداخت مردے خوش ظاہر و خوش محاورہ بود۔"

عبدالحمید لاہوری، عبدالحمید کا مولد اور مسکن لاہور تھا، علامی ابوالفضل کا شاگرد تھا، اس لیے اسی کے طرز انشا مین لکھنے کی مہارت پیدا کی لیکن زمانہ کی نامساعدت سے ٹھٹھہ[۲] مین آکر عزلت نشین ہو گیا تھا، اس کے ادب و انشا کی خبر شاہجہان کو ملی، تو اس نے اس کو دربار مین طلب کیا، شاہجہان چاہتا تھا کہ ابوالفضل کی "اکبر نامہ" کے طرز پر اس کی حکومت کی بھی تاریخ لکھی جائے، چنانچہ اسی خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے عبدالحمید کو تاریخ نویسی کے لیے مامور کیا، عبدالحمید خود لکھتا ہے:-

"بوسیلۂ بعضی از ملتزمان بساط تقرب بعرض اشرف اقدس رسید، کہ عبدالحمید لاہوری المولد و المنشا، کہ دل رمیدہ را از اختلاط این و آن و خاطر شوریدہ را از ارتباط فلان و

---

[۱] ایلیٹ ج ۷، ص ۱، برٹش میوزیم کیٹلاگ ص ۲۵۹ [۲] ایلیٹ ٹھٹھہ کے بجائے پٹنہ لکھتا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخہ مین بھی پٹنہ لکھا ہے، لیکن اورینٹل لائبریری پٹنہ کے فاضل کیٹلاگ نگار نے صاف طور سے بتایا ہے کہ پٹنہ نہیں ہے بلکہ ٹھٹھہ ہے، پٹنہ کتابت اور پڑھنے کی غلطی ہے، ملاحظہ ہو کیٹلاگ ج ۷، ص ۹۶

بهان، وا پرداختہ در معمورہ پٹنہ بزاویہ تنہائی، و بیغولہ بے نوائی در ساختہ است، و روش سخن پردازی و طراز انشا طرازی شیخ ابوالفضل نیک فرا گرفتہ، اگر نگارش معالی و مکارم این دولت والا و گذارش محامد و مآثر این سلطنت دست بلا، ید و باز گذاشتہ آید، آئینہ این نامہ منیف و این تصنیف شریف بنہجے کہ در خاطر دور بین صواب گزین مرکوز است نگاشتہ بود،"[1]

یہ تصنیف شاہجہان کی بیس سال کی حکومت کی تاریخ ہے، عمل صالح کا مصنف لکھتا ہے کہ شاہجہان اس کی خدمت سے اسقدر خوش تھا کہ اس نے دو مرتبہ اس کو روپے مین تلوا کر انعام عطا کیا،[2]

محمد وارث، آخر مین کبر سنی اور ضعف کے سبب عبدالحمید اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا، اسلیے اسکے شاگرد محمد وارث کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی گئی، جس نے بقیہ دس سال کی تاریخ کو مکمل کیا، وارث لکھتا تھا اور علامی فہامی سعداللہ خان دیکھتے تھے، پھر علاء الملک طونی المخاطب بہ فاضل خان جو شاہجہانی عہد مین خانساماں کے عہدہ پر ممتاز تھا اور اورنگ زیب کے زمانہ مین وزیر ہوا، اس پر نظر ثانی کرتا تھا، آخر کا کچھ حصہ اس نے خود لکھا،[3]

مرزا جلالہ طباطبائی، اصفہان سے ہندوستان ۱۰۴۲ھ مین آیا، شاہجہان کے دربار کے مورخین مین داخل ہوا، پانچ برس کی تاریخ لکھنے پایا تھا، کہ دشمنون نے اس کے خلاف سازشیں کی، اور وہ اس خدمت سے محروم کر دیا گیا، "شش فتح کانگڑہ" اسی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے، اس مین شاہجہان کی شاندار فتح کا حال لکھا ہے، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی تحریر مین چھ قسم کا طرز اختیار کیا ہے،[4]

---

[1] بادشاہ نامہ ج ۱ ص ۱۰ [2] عمل صالح [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۲۱ [4] اس عہد کی اور بھی مشہور تاریخین ہیں، مثلاً محمد صالح کی عمل صالح و مجلدٗن ہین اور محمد صادق خان کی شاہجہان نامہ، مگر ان مورخون کا بظاہر کوئی تعلق شاہی دربار سے نہین معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کتاب مین ان کا ذکر ضروری نہین سمجھا گیا،

خوشنویس | تیموریون نے اپنے دور مین فن خطاطی کو بھی بڑی ترقی دی، اکبری عہد کے خطاطون کا ذکر کیا جا چکا ہے، جہانگیر کو مصوری کے ساتھ اس فن سے بھی گہری دلچسپی تھی اور اس نے اپنے تمام لڑکوں کو اس کی خاص طور پر تعلیم دلائی، شہزادہ خسرو کی خوش خطی مشہور تھی، سلطان پرویز کلام اللہ کی کتابت مین اکثر مشغول رہتا، خود شاہجہان خط نستعلیق کا بڑا ماہر تھا، اس کی سرپرستی مین سید علی خان الحسینی جواہر رقم، عبدالباقی خداد یاقوت رقم، محمد مراد شیرین قلم، میر صالح ولد عبداللہ مشکین رقم، ملا باقر کشمیری، محمد حسین کشمیری، مقصود علی، میر محمد کاشی، حافظ عبدالرحمن رشیدائی، عبداللہ، شکراللہ، محمد مقیم، محمد جعفر، کفایت خان، درایت خان، محمد اکبر اور محمد موسیٰ نے نستعلیق تعلیق، نسخ اور شکستہ لکھنے مین بڑا کمال پیدا کیا، شاہجہان میر عماد الحسینی قزوینی کی خطاطی کا بڑا دلدادہ تھا، میر عماد ہندوستان نہین آیا، لیکن شاہجہان کی خدمت مین جب کوئی اس کی خطاطی کا کوئی نمونہ نذر کرتا، تو شاہجہان اس کو انعام مین یکصدی منصب عطا کرتا تھا، عبدالرشید دیلمی میر عماد کا بھانجہ اور شاگرد بھی تھا، وہ ہندوستان آیا تو دارا کا استاد مقرر ہوا، جس کے بعد اس نے دربار مین بڑا رسوخ حاصل کیا، تذکرہ خوشنویسان کے مولف نے اس کو ملک خطاطی کا پیغمبر کہا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ فن اسی کے ساتھ ختم ہوگیا، اس کے ممتاز شاگردوں مین داراشکوہ کے علاوہ، محمد اشرف خواجہ سرا، سیدای اشرف، عبدالرحمن اور میر حاجی وغیرہ تھے،[۱]

کتب خانہ | شاہی کتب خانہ کا داروغہ بعض اوقات خوشنویسون ہی مین سے مقرر ہوتا تھا، چنانچہ ۱۰۵۶ھ تک اس خدمت کو عبدالرحمن رشیدائی نے انجام دیا تھا، اس کے بعد میر صالح ولد عبداللہ مشکین رقم اس عہدہ پر متعین ہوا،[۲]

درسگاہین | ان درسگاہون کو جو اکبر و جہانگیر اور ان کے امرا نے قائم کین شاہجہان

[۱] تذکرہ خوشنویسان ص ۹۰-۱۰۵ [۲] شاہجہان نامہ ص ۵۰۵ ج ۲

نے نہ صرف یہ کہ ان کو بجنسہ قائم رہنے دیا، بلکہ انھیں فروغ دینے کی کوشش کی، ان کے علاوہ جامع مسجد دہلی کے جوار میں اس نے ایک مدرسہ دار البقا نامی قائم کیا، جس میں طلبہ معقول و منقول کی تعلیم حاصل کرتے تھے،[1]

اس مدرسہ کا فیض عرصہ تک جاری رہا، کچھ عرصہ کے بعد اس کی عمارتیں مرمت طلب ہو گئیں، تو صدر الدین خان بہادر صدر الصدور شاہجہان آباد نے ایک کثیر رقم خرچ کر کے از سر نو تعمیر کرائیں، اور وہاں کے طلبہ کے کھانے اور کپڑے کے اخراجات خود ہی برداشت کیے،

[1] آثار الصنادید از سید احمد خان باب تیسرا ص ۱۲

عالمگیر

"جسمانی ہمت اور تمکنت کے علاوہ اس نے اوائل زندگی ہی سے بادشاہت کی مشقتون اور خطرون کو اپنا شیوہ بنالیا تھا، اور اس عظیم الشان عہدہ کے لیے احترام ذات؛ معرفت ذات اور ضبط نفس سے اپنے کو تیار کیا۔ بادشاہون کے لڑکون سے بالکل مختلف اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا، اور زندگی کی آخری سانس تک کتابون سے محبت کرتا رہا۔ اگر ہم قرآن شریف کے ان متعدد نسخون کو نظر انداز بھی کردین، جن کو اس نے اپنے ہاتھون سے ایک عابد کی سرگرم ریاضت کے ساتھ لکھا، تو بھی ہم اس کو فراموش نہیں کر سکتے، کہ وہ ایک مشغول حکمران ہونے کے باوجود اپنی قلیل فرصت کو عربی کی فقہی اور مذہبی کتابون کے مطالعہ مین شوق سے گذارتا، اور پرانے اور نادر مخطوطات مثلاً نہایہ؛ احیاء العلوم اور دیوان صائب کو کتابون کے ایک کاہل عاشق کی ہوس سے ڈھونڈتا، اس کے کثیر رقعات اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے ایک خط کو مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا ہے، عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا، یہ اسی کی جودت طبع اور سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس ہندوستان مین مسلمانون کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاوی عالمگیری ہے، جو نہایت مناسب طور پر اسی کے نام کیساتھ منسوب ہے اور جس نے بعد کے عہد مین ہندوستان مین اسلامی نظام عدل کو واضح طور پر آسان کردیا ہے۔"[1]

یہ الفاظ اورنگ زیب کے اس سوانح نگار کے ہیں جس نے اس کے خلاف تعصب اور عداوت کا اظہار کرنا اپنی زندگی کا واحد اور معنی خیز مقصد قرار دیا ہے، مگر اورنگ زیب کے علمی کمالات کے لیے مذکورہ بالا تعریفی کلمات بادل ناخواستہ شاید اس لیے لکھ دیے گئے ہیں کہ اس عظیم المرتبت اور جلیل القدر فرمانروا کے آفتاب علم پر خاک ڈالنے کی کوشش بے سود ہوتی،

اورنگ زیب کی تعلیم لائق اور قابل اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی، جن ارباب علم و کمال سے اس نے فیض حاصل کیا، ان کے نام یہ ہیں:۔

مولانا عبداللطیف سلطانپوری، مولانا ہاشم گیلانی، علامی سعداللہ، ملا موہن بہاری، مولانا سید محمد قنوجی، ملا شیخ احمد معروف بہ ملا جیون، شیخ عبدالقوی، دانشمند خاں، [۱]

مولانا عبداللطیف سلطانپوری، مولانا ہاشم گیلانی، اور علامی سعداللہ کا ذکر پہلے آچکا ہے،

مولانا عبداللطیف کے بارے میں اورنگ زیب کہا کرتا تھا کہ میرے تمام استادوں میں ان کا حق زیادہ ہے، کیونکہ وہ میری تعلیم میں کسی قسم کی مداہنت اور تساہل کو راہ نہ دیتے تھے، [۲]

ملا موہن کا اصلی نام محی الدین تھا، قصبہ بہار شریف کے رہنے والے تھے، نو سال کی عمر میں کلام پاک حفظ کیا، حضرت شاہ حیدر نبیرہ شیخ وجیہ الدین گجراتی سے شرف بیعت حاصل کیا، شاہجہان کے دربار سے منسلک ہوئے، تو اورنگ زیب کی تعلیم کی بھی خدمت ان کے سپرد ہوئی، ۱۰۶۶ھ میں ۸۴ سال کی عمر میں وطن ہی میں وفات پائی،

---

[۱] اورنگ زیب کی تعلیم و تربیت اور انشاء و ادب پر جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے سابق رفیق دار المصنفین (حال پروفیسر اسماعیل کالج بمبئی) نے مقدمہ رقعات عالمگیر (سلسلۂ دار المصنفین) میں نہایت فاضلانہ بحث کی ہے، راقم الحروف نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے،

[۲] مرأۃ العالم قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۳۱۹،

مولانا سید محمد قنوجی ریاضی اور ادب کے ماہر تھے، عالمگیر نے امام غزالی کی اکثر کتابیں خصوصاً احیاء العلوم ان ہی سے پڑھی، تخت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد بھی عالمگیر نے ان سے استفادہ جاری رکھا، اور ہفتہ مین تین روز اس کے یہان علمی مجلس ہوتی، جس مین مولانا محمد قنوجی ضرور شرکت کرتے، فتاوی عالمگیری کی تدوین مین بھی وہ شریک رہے،[1] ۱۰۹۱ھ وہ اجمیر جاکر عالمگیر سے ملے تھے، اس کا ذکر مآثر عالمگیری کا مؤلف اس طرح کرتا ہے :-

"بیس محرم کو جامع الکمالات میر محمد قنوجی تخنگاہ سے آستانۂ شاہی پر حاضر ہوئے، اور شرف یابی سے شاد کام ہوکر ایک ہزار روپیہ دو خوان میوہ کے عطیات سے سرفراز ہوئے"[2]

عالمگیر اپنے بعض اہم خانگی کام ان ہی کی نگرانی مین انجام دلاتا تھا، مثلاً شاہجہان کی تجہیز و تکفین شاہی غسل خانہ مین ہوئی، تو وہ بھی موجود رہے، شاہزادہ محمد اعظم کا نکاح ان ہی کی وکالت مین انجام پایا،[3] ان کے لڑکے سید احمد خان کو عالمگیر نے محتسب کے عہدہ پر مامور کیا تھا،[4]

ملا جیون کا اصلی نام شیخ احمد تھا، صدیقی تھے، امیٹھی ضلع لکھنؤ مین پیدا ہوئے، کلام پاک حفظ کرکے اپنے عہد کے تمام ممتاز علماء سے تعلیم پائی، ملا لطف اللہ کوڑہ جہان آبادی سے فاتحہ فراغ پڑھا، حافظہ بڑا قوی رکھتے تھے، ایک بار کوئی قصیدہ سن لیتے تو وہ پورا یاد ہوجاتا درس کی کتابون کی عبارت بغیر دیکھے پڑھتے، عالمگیر کے دربار سے وابستہ ہوئے تو اس نے ان سے بہت سی کتابین پڑھین، اور پھر زندگی بھر ان کا احترام کرتا رہا، ان سے اسی طرح ادب سے پیش آتا جس طرح بچے باپ سے پیش آتے ہین، ملا صاحب کے بھولے پن، اور عالمگیر کی سعادت مندانہ

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۶، [2] مآثر عالمگیری ص ۱۴۵ اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ [3] ایضاً ص ۱۷-۳۷-۵۲
[4] ایضاً ص ۶۵،

اطاعت گذاری کے قصے اور لطیفے آج بھی مجلسوں میں بیان کئے جاتے ہیں، ملا صاحب کی پوری عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گذری، حرمین شریفین کی زیارت کو گئے تو مدینہ میں ربیع الاول ۱۱۰۵ھ میں منار کی شرح نور الانوار کے نام سے لکھنی شروع کی، ۷ جمادی الاول ۱۱۰۵ھ کو یہ شرح ختم کی، اور کسی کتاب سے مدد نہ لی، ان کی تفسیر احمدی آجتک مشہور ہے، ۱۱۳۰ھ میں دہلی میں وفات پائی، مگر امیٹھی میں دفن ہیں۔[۱]

شیخ عبدالقوی برہان پوری اپنے علم و فضل، سچائی اور سلامت روی کے لیے مشہور تھے، اس لیے اورنگ زیب کے استاد مقرر ہوئے، اورنگ زیب نے جب زمام سلطنت سنبھالی تو ان کو ہزار و پانصدی[۲] کا منصب عطا کیا، اور اس کے مقرب خاص رہے، وہ ان کو اخوند کہا کرتا تھا، اور خلوت میں بلا کر ان کے مشوروں سے مستفید ہوتا تھا، اسی لیے جلوس کے چوتھے سال اعتماد خان کا بھی خطاب دیا، تفسیر کے عالم ہونے کے علاوہ شرعی احکام یعنی فقہی جزئیات کا بھی بڑا لحاظ رکھتے تھے، احتساب میں بھی بہت سخت تھے، حضرت سرمد کی برہنگی کا سوال اٹھا تو عالمگیر نے ان ہی کو حضرت سرمد سے بازپرس کرنے کا حکم دیا، اور جب وہ ان کے سامنے لائے گئے، تو اپنی برہنگی کی وجہ یہ بتائی کہ شیطان قوی ہے اور پھر یہ رباعی پڑھی

خوش بالائے کردہ چنین پست مرا　　چشمے بد و جام بردہ از دست مرا
او در بغل من است و من در طلبش　　دزد عجبے برہنہ کردہ است مرا

شیخ عبدالقوی مطمئن نہیں ہوئے، مزید یہ کہ حضرت سرمد کی حسب ذیل رباعی سے ان کو انکار معراج کا بھی مجرم قرار دیا،

---

۱ تذکرہ علمائے ہند ی ص۲۴۔ ۲ مراۃ العالم میں ہے کہ دو ہزار و پانصدی کا منصب ملا (ورق ۲۹۷)

آن کو سر حقیقتش یاور شد | خود پہن تر از سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر شد احمد بفلک | سرمد گوید فلک با حمد در شد

اور اس کے بعد دوسرے فقہا کی رائے لیکر حضرت سرمد کے قتل کا حکم صادر کیا

یہ شیخ عبد القوی ایک جاسوس کے جرم کی تفتیش کے سلسلہ مین قتل ہوئے تو عالمگیر اپنے محبوب استاد کی موت پر بڑا متاسف اور دلگیر ہوا، ان کی اولاد کو اپنی نوازشون سے سرفراز کرتا رہا۔[۱]

دانشمند خان خطاب، نام ملا شفیعائی، اور وطن یزد تھا، ایران مین معقولات ومنقولات کی تعلیم پاکر تجارت کے سلسلہ سے ہندوستان آئے، مگر تجارت کرنے کے بجائے شاہی فوج سے منسلک ہوگئے لیکن اس ملازمت سے بددل ہوکر وطن واپس جانے لگے، شاہجہان کے مقربین نے ان کی استعداد ولیاقت کا ذکر اس سے کیا، تو اس نے فوراً شاہی فرمان بھیجکر ان کو دربار مین طلب کیا، وہ سورت پہنچ چکے تھے، لیکن شاہی حکم پاکر لوٹے، دربار مین پہنچے تو شاہجہان نے ان کی لیاقت کو جانچنا چاہا، ایک روز علمی مجلس منعقد کرائی جس مین ملا عبد الحکیم سیالکوٹی خاص طور پر مدعو کیے گئے۔ شاہجہان کی فرمایش سے ملا شفیعائی یزدی اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی مین علمی مذاکرہ شروع ہوا، بادشاہ نے علامی سعد اللہ کو حکم مقرر کیا، بحث ایاک نعبد وایاک نستعین کی تفسیر پر تھی، ملا عبد الحکیم اور ملا شفیعائی نے اہم نکتے بیان کئے، اور جب بحث ختم ہوئی تو علامی سعد اللہ کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دونون مین سے کس کا علم زیادہ گہرا اور وسیع ہے، شاہجہان ملا شفیعائی کی فصاحت گفتار سے خوش ہوا اور شاہی ملازمین کے زمرہ مین داخل کر لیا، وہ رفتہ رفتہ ترقی کرکے میر بخشی کے عہدہ پر مامور ہوئے، اور دانشمند خان کے خطاب اور سہ ہزاری ہشت صد سوار کے منصب

---

۱ مآثر الامراء ج ۱ ص ۲۹-۲۲۷، مراۃ العالم ورق ۲۹۸

سے سرفراز کیے گئے. شاہجہان کے آخری زمانہ حکومت مین کسی سبب سے گوشہ نشین ہوگئے تھے، جب اورنگ زیب تخت پر جلوہ افروز ہوا، تو پھر شاہی لطف و کرم سے نوازے گئے، میر بخشی اور مختلف عہدون کی خدمت ان کے سپرد ہوتی رہی، پنجہزاری منصب بھی عطا ہوا، فرحۃ الناظرین مین ہے کہ عالمگیر بادشاہ ہو جانے کے بعد بھی ان سے خاص خاص کتابین پڑھا کرتا تھا، امام غزالی کی احیاء العلوم ان ہی سے آخر تک پڑھی. دانشمند خان کے بارے مین مآثر الامراء مین ہے:

"امیر موصوف اپنے زمانہ کے بڑے فضلاء مین سے تھے، نیک نفسی اور نیک اندیشی مین مشہور تھے، ان کے بعد اب تک ایسے لوگون مین جنھون نے فضیلت اور امارت کو ایک ساتھ جمع کر لیا تھا، کوئی ان کے درجہ کا نہین پیدا ہوا"[۱]

۱۰۸۱ھ مین وفات پائی،

اورنگ زیب کو علوم دینیہ سے فطری رغبت تھی، لائق اور فاضل اساتذہ کی نگرانی مین ان علوم سے اس کا شغف اور بھی زیادہ بڑھا، عالمگیر نامہ مین ہے:

از کمالات کسبیہ آنحضرت کہ زینت بخش حالات قدسیہ وہبیہ گشتہ، تتبع علوم دینیہ از حدیث و تفسیر عربیہ و فقہ شریف حنفیہ است، از بس بممارست مراتب شرعیہ و استکشاف عقائد اصلیہ و مسائل شرعیہ اشتغال ورزیدہ اند، قوت حافظۂ اشرف، مخزن این حقائق شدہ و بسیاری از کتب طریقت و سلوک و اخلاق چون احیاء العلوم و کیمیاے سعادت و دیگر تصانیف عرفا و اکابر رسائل و مولفات علماے باطن و ظاہری بمطالعہ ہمایون

[۱] مآثر الامراء جلد دوم ص ۳۲ - ۳۰ نیز دیکھو مراۃ العالم قلمی ورق ۲۹۷، و اقتباس فرحۃ الناظرین لاہور ص ۷۱

رسید مل ..... عضلات وکشف اسرار آن فرمودہ اند و بالفعل نیز بعد فراغ از نظم مہام سلطنت و سروری تمہید مراسم دین پروری و عدالت گستری باین شرائط اشتغال بپیوستگی دارند۔ [1]

اسی چیز کو مآثر عالمگیری کا مصنف ان مختصر الفاظ مین پیش کرتا ہے،

قبلہ عالم کے کمالات کسبیہ کا عظیم الشان کارنامہ علوم دینیہ یعنی فقہ و تفسیر و حدیث کی تحصیل ہے، جہان پناہ کو حضرت امام غزالی کی تصنیفات، شیخ شرف الدین یحیٰی منیری کے منظومات اور شیخ زین الدین و قطب الدین محی الدین شیرازی کے رسائل سے خاص شوق تھا، اور یہ کتابین اکثر مطالعے مین رہتی تھین [2]

اورنگ زیب حافظِ قرآن بھی تھا، اور یہ سعادت تیموری بادشاہون مین صرف اسی کو حاصل تھی، اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اُس نے کلام پاک اس وقت حفظ کیا جب وہ اپنی عمر کے تینتالیسوین سال مین تھا، اور یہ دولت صرف ایک سال کے اندر جمع کی ۱۰۷۱ھ مین حفظ کرنا شروع کیا، اور ۱۰۷۲ھ مین ختم کیا، سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰی سے ابتدا کی اور لَوْحٍ مَحْفُوْظٍ سے اختتام کی تاریخ نکلتی ہے، اورنگ زیب کے ایک درباری شاعر نے اس موقع پر یہ شعر کہا:

تو حامیٔ شرع و حامیٔ تو شارع — تو حافظِ قرآن و خدا حافظ تو [3]

مآثر عالمگیری مین ہے:۔

حضرت کے فضائل مین سب سے اہم و عظیم الشان امر حفظ قرآن مجید کی سعادت ہے، اگرچہ ابتدا ہی سے قبلۂ عالم کو اکثر سورتین قرآن مجید کی حفظ تھین، لیکن تمام و کمال کلام پاک کے حفظ سے بعد جلوس بہرہ اندوز ہوئے، حضرت کو قرآن پاک بہت اچھا

---

[1] عالمگیرنامہ ص۱۰۹۱، [2] مآثر عالمگیری ص۵۳۳، [3] عالمگیرنامہ ص۱۰۹۲ و مراۃ العالم قلمی نسخہ،

یاد تھا، اور اس امر مین بے حد اہتمام فرماتے تھے کہ کلام الٰہی کو نہایت صحت کے ساتھ یاد رکھین، قصۂ عالم کے شروع حفظ کی تاریخ خود قرآن کریم کی آیت سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ہے، اور ختم کلام مجید کا سنہ لَوحِ محفوظ کے اعداد سے برآمد ہوتا ہے، (۱۰۸۳)

اورنگ زیب فن خطاطی مین یدطولیٰ رکھتا تھا، یہ فن اس نے سید علی خان الحسینی جواہر رقم[1] اور عبد الباقی حداد[2] (عبد اللہ) سے سیکھا، چنانچہ اسکو خط نسخ اور خط نستعلیق لکھنے مین کامل مہارت تھی، منشی کاظم مصنف عالمگیر نامہ لکھتا ہے:-

از رتبۂ خط و حسن تحریر آن شہنشاہ فلاطون فطنت سکندر نظیر کہ صفحات روزگار و اوراق دفاتر لیل و نہار از ان زینت پذیر است خامہ نکتہ پرواز جادو فن را چہ یارائے دم زدن بقدرت کلک بدائع آثار معنی استادی و سحر نگاری را چنان بر کرسی نشانیدہ اند کہ دست استادان اقالیم سبعہ خط بدان نتواند رسید و بہ رشحۂ فیض انامل در بار نہال موزون قلم را در خوشنویسی شاخ و برگی بخشیدہ کہ یکتایان صنعت خط از تتبع آن شیوہ جز خجلت ثمری نتوانند چید، خط نسخ آن حضرت کہ رقم نسخ خط یاقوت و صیرفی تواند بود، در غایت پختگی و مزہ و متانت و اسلوب است و کمال قدرت در نوشتن آن دارند، اکثر اوقات توفیق ثواب اندوزی کتاب کلام اللہ از ضمائم عبادات و کرائم عادات آن شہنشاہ دین پناہ است،...... خط نستعلیق آنحضرت بے شائبہ اطرای مدح طرازی و اغراق نکتہ پردازی دران رتبہ است کہ قطعہاے کہ درین ایام ذوق و سرگرمی مشق قلم پذیر خامہ اشرف گشتہ بقطعہاے خوب استادان کہ عمر گرانمایہ صرف تحصیل آن سرمایہ ساختہ بتکمیل امرے دیگر نپرداختہ اند در نظر خط شناسان مبصر مشتبہ می شود، و شکستہ و نستعلیق در غایت مغز داری و صفا و متانت و پختگی می نویسند،[3]

---

[1] تاریخ خوشنویسان سنہ ۵۰، [2] ایضاً، ص ۱۲۵، [3] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۲-۱۰۹۳